بزم طلوع اسلام کا ہفتہ وار ... بروز جمعۃ المبارک ... 4½ بجے ... شام ... بالمقابل ... روڈ راولپنڈی ... ہوتا ہے ... شرکت فرمائیے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1968

سچّے موتی

عقل کی افضلیت

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے ام المومنین! ایک شخص رات کو زیادہ سوتا ہے اور کم عبادت کرتا ہے۔ دوسرا زیادہ عبادت کرتا ہے اور کم سوتا ہے۔ آپ کے نزدیک دونوں میں سے کون زیادہ پسندیدہ ہے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک دفعہ ایسا ہی سوال رسول اللہؐ سے کیا تھا تو آپؐ نے جواب دیا تھا کہ ان میں سے جو زیادہ عقلمند ہے وہ — میں نے عرض کیا — یارسول اللہؐ! میں نے تو ان کی عبادت کے متعلق پوچھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے عائشہؓ! ان کی عقلوں کے متعلق سوال ہوگا۔ پھر جو شخص زیادہ عقلمند ہوگا وہی دُنیا اور آخرت میں افضل ہوگا۔

(کتاب الاذکیا — ابن جوزی)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

ادارۂ طلوعِ اسلام کی حیات افروز پیشکش

جہاد کیا ہے ——؟

جہاد اور جنگ میں کیا فرق ہے؟

مومن اور مجاہد کس طرح مرادف الفاظ ہیں —— قرآن کی رو سے قوانین جنگ کیا ہیں —— اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جواب۔

ایک مختصر لیکن جامع تصنیف۔

بصیرت افروز۔ حیات آموز۔

قیمت صرف —— دو روپے فی جلد

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

پاکستان کے معمارِ اوّل

سرسیّد کی صحیح عظمت اور ہماری سیاسی زندگی میں اس کا مقام بلند ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتا تو پاکستان بھی وجود میں نہ آتا۔ اس مختصر لیکن نہایت جامع کتاب میں سرسیّد کا صحیح مقام نہایت دلکش انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ بڑی پُر از معلومات کتاب ہے۔ قیمت صرف۔ تین روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ ـــ پاکستان ـــ دس روپے
سالانہ ـــ ہندوستان ـــ پندرہ روپے
سالانہ ـــ غیر ممالک ـــ ایک پونڈ

اپریل ۱۹۶۸ء

قیمت فی پرچہ
پاکستان ـــ ایک روپیہ
ہندوستان ـــ ڈیڑھ روپیہ

جلد ۲۱ نمبر ۴

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ
طلوعِ اسلام
۲۵ بی ـ گلبرگ ۲ ـ لاہور

فہرست

۱۔ لمعات ـــــــــ ۲
۲۔ تصحیح ـــــــــ ۱۶
۳۔ درسِ اوّل ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۱۷
۴۔ باب المراسلات ـــ (ایک قرآنی گھرانہ) ـــــ ۳۴
۵۔ حقائق و عبر ـــ (پندرہ لاکھ کا اجتماع) ـــ (نوائے وقت کی خدمت میں) ـــــ ۳۷
۶۔ تصوّف ـ شہپرہ بازوں کی کمند ـــ (علامہ اقبالؒ) ـــــ ۴۱
۷۔ سمندر کا عالمی کردار ـــ (محترم خورشید عالم صاحب) ـــــ ۴۵
۸۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ملکیتِ زمین ـــ (سید جعفر شاہ صاحب پھلواری) ـــــ ۵۴
۹۔ نقد و نظر ـــ (ENGLISH TRACED TO ARABIC) ـــ (تجارتی سود۔ تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے) ـــ (ردِ بلال) ـــ ۶۱
۱۰۔ مطالب الفرقان ـــــــــ ۶۵-۸۰

ایڈیٹر ـ محمد خلیل ـ ناشر ـ سراج الحق ـ مقام اشاعت ـ ۲۵ بی گلبرگ ۲ ـ لاہور ـ [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مرکزی وزیر قانون محترم ایس۔ ایم۔ ظفر صاحب کے ایک بیان کے مطابق، حکومت پاکستان نے صدر مملکت کے ایما پر ایک بورڈ کی تشکیل کی ہے جو ایک ایسی کتاب مرتب کرے گا جس میں دستور پاکستان کی تشریح اس انداز سے کی جائے گی کہ اس کی روح، مفہوم اور مقصد عوام کی سمجھ میں بھی آجائے۔ اس بورڈ میں چار ممتاز پروفیسروں کو شامل کر لیا گیا ہے اور دو نامور قانون دان حضرات کی خدمات حاصل کرنے کی مزید تجویز ہے۔

(بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ ۲۳ فروری ۱۹۶۸ء)

اس قسم کی کتاب کی تدوین و اشاعت کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ باقی رہا یہ کہ وہ کتاب، پیش نظر مقصد کو کس حد تک پورا کرے گی، اس کا دار و مدار کتاب کے مندرجات پر ہوگا۔ دستور پاکستان (۱۹۶۲ء) میں متعدد نکات ایسے ہیں جن کی وضاحت کی بڑی ضرورت ہے۔ ان کے لئے ہم مجوزہ کتاب کی اشاعت کا انتظار کریں گے۔ لیکن ان میں سے ایک نکتہ ایسا ہے جس کی طرف ہم اس بورڈ کی خصوصی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔

اختیارات کے تعین اور تقسیم کے بعد کسی مملکت کے دستور کا اولین فریضہ اس امر کی وضاحت ہوتا ہے کہ مملکت میں قانون سازی کا اصول کیا ہوگا اور طریق کار کیا۔ اگر کسی دستور میں یہ نکتہ ہی واضح نہ ہو، یا وہ اصول ایسا ہو جس پر عمل کرنا ممکن نہ ہو، تو نہ صرف یہ کہ وہ اصول بے کار ہوگا بلکہ اس مملکت کی گاڑی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ جب کسی مملکت میں اس کے دستور کے مطابق، قانون ہی وضع نہیں ہو سکے گا تو اس مملکت کی گاڑی چل کیسے سکے گی؟ ہمیں افسوس ہے کہ جب ہم اس نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو موجودہ دستور پاکستان کی متعلقہ شق نہ صرف مبہم نظر آتی ہے بلکہ ناممکن العمل بھی۔ ہم اس حقیقت کی طرف اس سے

پہلے بھی کئی بار ارباب بست وکشاد کی توجہ مبذول کرا چکے ہیں۔ اور اب جبکہ اس دستور کی وضاحت اور مفہوم کشائی کے لئے عملی قدم اٹھایا جا رہا ہے، ہم اس کی طرف، اس بورڈ کے اراکین کی توجہ منعطف کرانا اپنا ملّی اور دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔

(۰)

ترمیم شدہ دستور پاکستان میں، قانون سازی سے متعلق اصول کا ملخص حسب ذیل ہے۔

(۱) مملکت کا کوئی قانون، کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا۔

(۲) جہاں تک پرسنل لاز (شخصی قوانین) کا تعلق ہے، ہر فرقہ کی "کتاب وسنت" کی تعبیر اس فرقہ کے لئے مستند سمجھی جائیگی۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس اصول کی دفعہ ۲ خود دفعہ ۱ کے خلاف ہے۔ دفعہ ۲ میں "پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق کی گئی ہے۔ اور (۲) مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے وجود کو آئینی سند عطا کر دی گئی ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں، کتاب وسنت کے خلاف ہیں۔ جہاں تک پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق کا تعلق ہے، نہ صرف یہ کہ اس تفریق کی کوئی سند قرآن کریم یا احادیثِ نبوی سے نہیں مل سکتی، بلکہ یہ تصور ہی یکسر خلافِ اسلام ہے۔ قرآن کریم مسلمانوں کی پبلک اور پرسنل لائف میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ یہ ثنویت مملکت کے سیکولر نظام کی پیداوار ہے جس میں پرسنل لاز مذہب کے دائرے میں شمار کئے جاتے ہیں اور پبلک لاز حکومت کے حیطۂ اقتدار میں۔ اسلام اس ثنویت کو مٹانے کے لئے آیا تھا، اور عہد رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ کی اسلامی حکومتوں نے اسے عملاً مٹا کر دکھا دیا۔ لیکن سیکولر نظامِ حکومت نے، دورِ جاہلیت کی اس ثنویت کو پھر سے زندہ کر دیا، اور اب دنیا کی ہر سیکولر حکومت کے دستور نے اسے تسلیم کر رکھا ہے۔ لہٰذا، دستورِ پاکستان کی یہ شق، سیکولر نظام کے تصور کے تو مطابق ہے، کتاب وسنت کے مطابق ہرگز نہیں!

جہاں تک فرقوں کے وجود کا تعلق ہے، قرآنِ کریم بہ نصِ صریح اسے شرک قرار دیتا ہے۔ جب کہتا ہے کہ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۔ (۳۰/۳۰)۔ تم اپنی تمام توجہات کو اسی ایک نقطہ پر مرکوز کرتے ہوئے دین کو مستحکم کرو۔ یہ اس طرح کہ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ۔ تم ہر معاملہ میں خدا کی طرف رجوع کرو۔ وَاتَّقُوْهُ ۔ اور اس کا تقویٰ اختیار کرو۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۔ اور صلوٰۃ قائم کرو۔

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔ (۳۰/۳۱)

اور تم مشرک نہ بن جاؤ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈال دی۔ اور ان میں فرقے پیدا ہو گئے۔ پھر ہر فرقہ اپنے اپنے طریق پر مگن ہو کر بیٹھ گیا۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کس طرح فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیتا ہے۔ اس صراحت کے بعد وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہتا ہے کہ:-

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

یقیناً جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

یعنی دین میں فرقوں کا وجود خدا کے نزدیک شرک ہے اور اس کے رسول کا ان سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اسی بنا پر مسلمانوں سے تاکیداً کہہ دیا گیا تھا کہ:-

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۔ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔ (۳/۱۰۴)

دیکھنا! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (خدا کی طرف سے) واضح ہدایت آجانے کے بعد باہمی تفرقہ اور اختلاف پیدا کر لیا۔ ان کے لئے سخت عذاب ہوگا۔

ہم مجوزہ بورڈ کے اراکین سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنی کتاب میں اس کی وضاحت فرما دیں کہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق اور فرقوں کا وجود کس طرح "کتاب و سنت" کے مطابق ہے۔ واضح رہے کہ ۱۹۶۲ء کے اصل دستور (ORIGINAL CONSTITUTION) میں یہ دونوں باتیں نہیں تھیں۔ علمائے کرام نے (جن میں جماعت اسلامی پیش پیش تھی) اس دستور کے خلاف ہنگامہ برپا کیا اور ایک ترمیم کے ذریعے ان دونوں باتوں کو (جو صریحاً اسلام کے خلاف ہیں) دستور میں شامل کرایا۔ "علمائے کرام" کی یہ حرکت تو چنداں وجہ تعجب نہیں تھی کہ ان کا وجود ہی امت میں اختلاف کا رہین کرم ہے ــــ رسول اللہ کے زمانے میں نہ امت میں اختلاف تھا، نہ مسلمانوں میں فرقوں کا وجود ــــ لیکن دنیا اس پارلیمان کو یقیناً بنگاہِ حیرت دیکھ رہی تھی جو ایک طرف دستور میں یہ شق رکھ رہی تھی کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور اُسی سانس میں یہ شق بھی دستور میں شامل کر رہی تھی جو کتاب کے بھی خلاف ہے اور سنت کے بھی! لیکن ان کا مقصد تو مولوی صاحبان کو خوش رکھنا تھا۔ اس لئے کہ انہوں نے عوام سے

ووٹ لینے ہوتے ہیں اور عوام کے متعلق (غلط یا صحیح) ان کے ذہن میں ہے کہ وہ مولویوں کے اثر میں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب ہمارے اس استنباط کو چیلنج کرتے ہوں تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ثابت کر دیں کہ یہ شق کتاب وسنت کے خلاف نہیں۔ طلوع اسلام کے صفحات ان کے رشحاتِ قلم کے لئے کھلے ہیں۔

(۰)

اب دستورِ پاکستان کی پہلی اور بنیادی شق کی طرف آیئے۔ یعنی اس شق کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اصلی دستور ORIGINAL CONSTI-TUTION) میں یہ شق بھی نہیں تھی۔ (اس میں اتنا ہی کہا گیا تھا کہ مملکت کا کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا)۔ اس شق کو بھی، بعد میں، ملک میں شورش برپا کرا کر، شاملِ دستور کرایا گیا تھا، اور (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس شورش خیزی میں جماعت اسلامی پیش پیش تھی۔ اس جماعت نے اس ترمیم پر کیوں اس قدر زور دیا تھا، اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر کی جائے گی۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ کیا اس شق کے مطابق قانون سازی ممکن العمل بھی ہے؟

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، اس شق کی رُو سے، کسی قانون کے اسلامی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ (۱) قرآن کے خلاف نہ ہو۔ اور (۲) سنت کے خلاف نہ ہو۔ قرآن کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک متعین و معروف کتاب ہے جس کا ایک ایک لفظ تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ اس کی کسی سورت یا آیت کے متعلق تو ایک طرف، اس کے کسی ایک لفظ کے متعلق بھی یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ یہ قرآن میں ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس شرط کے دوسرے جزو ــــ سُنّت ــــ کی بھی یہی پوزیشن ہے؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے جس پر اس سارے سوال کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بڑی ہی گہری توجہ کا محتاج ہے۔ نیز اس لئے بھی کہ (ایک خاص سیاسی مصلحت کے تحت) یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ طلوع اسلام منکرِ سنت ہے اس لئے سنت کی بحث کے سلسلہ میں اس کی کوئی بات درخورِ اعتنا نہیں ہونی چاہیئے۔ اس پراپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہے کہ جونہی طلوع اسلام نے قانون سازی کے متعلق کوئی بات کی، اسے یہ کہہ کر جھٹک دیا جاتا ہے کہ اس منکرِ حدیث اور منکرِ سنت کا کیا ہے؟ اسے اسلام سے کیا تعلق؟ ہماری آپ سے اتنی گزارش ہے کہ آپ اس سوال کو تھوڑے سے وقت کے لئے الگ رکھ دیں کہ طلوع اسلام منکرِ سنت ہے یا کچھ اور۔ آپ صرف یہ دیکھیں کہ جو کچھ آئندہ سطور میں کہا جا رہا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ اگر وہ ٹھیک ہے تو اسکے بعد آپ کی فکر آپ کو جس نتیجہ پر پہنچائے، اسے صحیح تسلیم کر لیجئے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس پر آپ کو کوئی

اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ اب غور سے سنیئے کہ سنت کی پوزیشن کیا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم ایک متعین اور متعارف کتاب ہے۔ لیکن دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے متعلق کہا جا سکے کہ وہ سنتِ رسولؐ اللہ کا مجموعہ ہے ــــ کوئی کتاب ایسی نہیں ــــ اہلحدیث حضرات کہتے ہیں کہ سنت اور حدیث مرادف الفاظ ہیں۔ یعنی حدیث ہی کو سنت کہا جاتا ہے۔ اس تعریف کی رُو سے "قرآن و سنت" کے معنی ہوں گے "قرآن اور حدیث" ــــ لیکن دیگر حضرات، اس سے متفق نہیں۔ چنانچہ سید ابوالاعلےٰ مودودی صاحب اس باب میں (اپنی کتاب "رسائل و مسائل حصہ اول) میں لکھتے ہیں۔

> سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے ایک خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جز سنت ہے اور کون سا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبیؐ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے، اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں، کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔
>
> (ص ۳۱۱ تا ص ۳۱۷)

اسی کتاب میں وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

> بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپؐ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا، نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرز خاص کا لباس

نبی پہنتے تھے۔ اور شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق، یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں، ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔ (ص ۳۱۴)

یعنی اہل حدیث حضرات کے نزدیک، ہر وہ بات جو احادیث کے صحیح مجموعوں میں درج ہے، سنت ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ سنت صرف اس طریق عمل کو کہینگے جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے وہ تمام باتیں خارج ہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً ص ۳۰۸)

اس سے ذرا پہلے وہ لکھتے ہیں:-

جو امور آپؐ نے عادۃً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کرلیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔ (ص ۳۰۷)

مودودی صاحب کی پیش کردہ سنت کی اس تعریف (DEFINITION) کے متعلق مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم (سابق صدر جمعیت اہلحدیث، مغربی پاکستان) لکھتے ہیں کہ

میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہلحدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہلحدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال اور تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔

(جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، ص ۱۱)

آپ نے غور فرمایا کہ خود سنت کی تعریف کے سلسلہ میں ان حضرات میں باہمی اختلافات کس قدر گہرے ہیں۔

مودودی صاحب، اہلحدیث حضرات کے مسلک کو "دین میں خطرناک تحریف" قرار دیتے ہیں۔ اور اہل حدیث حضرات کے نزدیک، مودودی صاحب کا مسلک، معتزلہ کا مسلک ہے۔

اگر اہل حدیث حضرات کے مسلک کو قبول کر لیا جائے تو اس سے کیا دشواریاں پیش آتی ہیں؟ اس کے متعلق ذرا آگے چل کر بات کی جائے گی۔ اس مقام پر یہ دیکھئے کہ اگر مودودی صاحب کے مسلک کو اختیار کیا جائے تو صورت کیا بنے گی؟ حدیث کی کسی کتاب میں یہ نہیں وضع کیا گیا کہ رسول اللہ نے فلاں بات، رسالت کی حیثیت سے کی تھی اور فلاں بات بشری حیثیت سے۔ فلاں بات اپنے شخصی مذاق یا قومی طرزِ معاشرت کی رُو سے کی تھی، اور فلاں بات دینی حیثیت سے۔ حدیث کی کسی کتاب میں یہ تفریق و تمییز نہیں کی گئی۔ لہٰذا اس کے لئے پہلے یہ کرنا ہوگا کہ احادیث کے تمام مجموعوں سے، ان دونوں قسموں کے امور کو الگ الگ کیا جائے اور اس طرح سنتِ رسول اللہ کو متعین کیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ یہ کام کون کرے اور جو لوگ بھی اس فریضہ کو سرانجام دیں، اس کی کیا ضمانت ہے کہ دیگر حضرات ان کے نتائج سے متفق ہوں۔ اہلحدیث حضرات تو سرے سے اس تحریک ہی کے مخالف ہوں گے۔ سُنّی حضرات[1] میں پاکستان میں فقہ حنفی کے پیروؤں کی اکثریت ہے۔ (بلکہ بہیئتِ مجموعی یوں سمجھئے کہ یہ سب کے سب حنفی ہیں) ان کے ذمہ دار علماء میں سے کوئی بھی اس بات سے متفق نہیں ہوگا کہ مودودی صاحب یا ان کے ہم خیال حضرات، سنت کا جو مجموعہ اس طرح مرتب کریں، اسے مستقل شریعت کا درجہ دے دیا جائے۔ نہ ہی مودودی صاحب اس کے لئے آمادہ ہونگے کہ کسی دوسرے کے اس طرح مرتب کردہ مجموعۂ سنت کو وہ مستقل شریعت تسلیم کر لیں۔

یہاں تک بات یہ ہوئی ہے کہ ایک گروہ، احادیث ہی کو سنت قرار دیتا ہے اور دوسرے گروہ کا مسلک یہ ہے کہ احادیث سے سنت کو مرتب کیا جانا چاہیئے۔ لہٰذا، ان دونوں کے نزدیک، حدیث، قدرِ مشترک ہے۔ (اگرچہ اس کے قانونِ شریعت بننے کے عملی انداز میں ان دونوں میں بنیادی فرق ہے) اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا، حدیث کے متعلق یہ حضرات ایک دوسرے سے متفق ہیں؟

احادیث لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ان میں سے چھ کتابیں ایسی ہیں جنہیں صحیح احادیث کے مجموعے سمجھا جاتا ہے۔ انہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی)[2]۔ ان میں

---

[1] ہم نے اس سلسلہ میں شیعہ حضرات کے متعلق بات نہیں چھیڑی اس لئے کہ ان کے احادیث کے مجموعے الگ ہیں اور فقہ کے قوانین الگ۔ وہ سنت، حدیث یا فقہ کے متعلق سُنّی حضرات کے کسی فیصلے کے متبع نہیں ہو سکتے۔

[2] بعض حضرات موطا امام مالکؒ کو بھی ان میں شامل کرتے ہیں۔

سے بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے اور بخاری کو "اصح الکتاب بعد کتاب اللہ" کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ سمجھا جائے گا کہ احادیث کے ان مجموعوں میں جس قدر احادیث درج ہیں، وہ (شیعہ حضرات کو چھوڑ کر باقی) مسلمانوں کے نزدیک صحیح احادیث ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں۔ اہلحدیث کا اس باب میں مسلک یہ ہے کہ

بخاری اور مسلم کی صحت پر اُمت متفق ہے .. .. ان احادیث کی صحت قطعی ہے

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث۔ صفحہ ۴۸)

قطعی صحت کے معنی یہ ہیں کہ:

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا .. .. جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا۔ اور ملت سے خروج کے مرادف

(ایضاً صفحہ ۵۵)

یعنی ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے، بخاری یا مسلم کی کسی ایک حدیث سے انکار کفر ہے اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مرادف۔ اس کے برعکس، مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

اس ایک نکتہ کی رُو سے بھی دیکھئے، تو مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا حضرات، اہل حدیث حضرات کے عقیدہ کے مطابق کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار پا جاتے ہیں۔ جماعت اہل حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ:

جبریل، قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث صفحہ)

اس کے برعکس مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ:

قولِ رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآن کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں

بخلاف اس کے روایات ہیں اس شک کی گنجائش ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔

(رسائل و مسائل جلد اول ص۷۶)

دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں:

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی بحث کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل، صفحہ ۲۵۰)

اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ:

مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں کے بعد نہیں بلکہ چند گھنٹے بعد ہی) لوگوں سے پوچھ لیجئے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کرے گا، کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اسکا صحیح ملخص بیان کر دیگا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دیگا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی وہ نقل و روایت میں غلطیاں کرے گا۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ ص۳۲۹-۳۳۰)

اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک —

(۱) حدیث کی کوئی کتاب بھی ایسی نہیں جس کی ہر حدیث کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔

(۲) احادیث کو پرکھنے کا جو اصول ائمہ حدیث نے بیان اور اختیار کیا تھا، اور جس کی رُو سے احادیث کی جانچ پڑتال کر کے صحیح احادیث کو غلط سے الگ کر لیا تھا، وہ اصول ہی صحیح نہیں۔

لہٰذا —

(۳) احادیث کے تمام مجموعوں کی از سر نو جانچ پڑتال کر کے صحیح احادیث کو، ضعیف احادیث سے الگ کیا جائے گا۔

ہم نے اس بحث کو اس طوالت کے ساتھ اس لئے لکھا ہے کہ سنت اور حدیث کی صحیح پوزیشن سامنے آجائے۔ اس کے بعد ہم ملک کے قانون دان حضرات سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جب یہ سوال پیدا ہو کہ فلاں قانون سنت کے مطابق ہے یا نہیں تو کیا کوئی معیار ایسا ہے جس کی رُو سے اس اہم ترین دستوری مسئلہ کا فیصلہ کیا جا سکے؟ اور جب صورت یہ ہے کہ نہ ہم سنت کی کوئی جامع تعریف (DEFINITION) پیش کر سکتے ہیں اور نہ ہی یہ بتایا جا سکتا ہے کہ سنت کس کتاب میں ملے گی، تو کیا دستور پاکستان کی زیر نظر شق کی رُو سے، اس ملک کے لئے اسلامی قوانین وضع کئے جانے کا کوئی امکان ہے؟

ہم نے یہ کہا تھا کہ ہم بتائیں گے کہ امیر جماعت اسلامی (مودودی صاحب) نے دستور میں اس شق کے شامل کئے جانے کے لئے اس قدر ہنگامہ کیوں برپا کرایا تھا؟ عوام کو مطمئن (اور مشتعل) کرنے کے لئے تو اس کا صاف جواب یہ ہے کہ اتباعِ سنتِ رسول اللہ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے اس لئے دستور پاکستان میں اس شق کا رکھا جانا نہایت ضروری ہے۔ لیکن ذرا گہرائی میں جائیے تو بات واضح ہو جائے گی کہ مودودی صاحب اس پر اس قدر زور کیوں دیتے ہیں۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ مودودی صاحب کی تصریحات کے مطابق۔

(۱) اس وقت کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں صحیح سنت رسول اللہ درج ہو۔ اسے صحیح احادیث سے مرتب کرنا ہوگا۔

(۲) حدیث کی بھی کوئی کتاب ایسی نہیں جس کی ہر حدیث کو صحیح مانا جا سکے۔ صحیح احادیث کا اس قسم کا مجموعہ بھی مدون کرنا ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کون کرے گا؟ اس کے متعلق مودودی صاحب جو کچھ فرماتے ہیں وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایسا وہی شخص کر سکتا ہے

> جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے ..... اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت، کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے ..... اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ

محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر فنا وہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ سکتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۰۲ تا صفحہ ۳۲۴)

یہیں تک نہیں۔ مودودی صاحب نے آگے چل کر یہ بھی کہا ہے کہ اگر کسی معاملہ کے متعلق کوئی حدیث موجود نہ ہو، تو مزاج شناسِ رسولؐ یہ بھی بتا سکے گا کہ اس مقام پر رسول اللہ کیا فیصلہ فرماتے؛ اس سے واضح ہے کہ پاکستان میں قوانین سازی کے سلسلہ میں جب یہ سوال سامنے آئے گا کہ فلاں قانون سنت کے مطابق ہے یا نہیں، تو اس کے لئے آپ کو "مزاج شناسِ رسول" کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اس کا فیصلہ اس باب میں آخری اعتباری ہوگا۔ یعنی قانون سازی کے معاملہ میں اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) مزاج شناسِ رسولؐ کو حاصل ہوگا (نہ کہ مملکتِ پاکستان کو) — اور اس کا غالباً آپ کو علم ہی ہوگا کہ منیر انکوائری کمیٹی کے روبرو جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار حضرات نے اس کا اعتراف کیا تھا کہ ان کے نزدیک یہ مزاج شناسِ رسولؐ خود مودودی صاحب ہیں۔

اب آپ نے سمجھ لیا کہ مودودی صاحب نے دستور پاکستان میں یہ شق کیوں داخل کرائی تھی کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ یہ شق بالفاظ دیگر یوں ہے کہ ملک میں کوئی قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جب تک مودودی صاحب اس کی تصویب نہ فرما دیں۔ اگر ہمارا اخذ کردہ یہ نتیجہ غلط ہو تو جماعت اسلامی براہ کرم اس کی تصریح کر دے کہ ان کے نزدیک اس وقت ملک میں مزاج شناسِ رسولؐ کون ہے؛ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کا منتخب کردہ مزاج شناسِ رسولؐ، صرف انہیں کے لئے سند اور حجت ہوگا۔ دوسرے لوگ اسے پرکاہ جتنی وقعت بھی نہیں دیں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) نے لکھا تھا:

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھے یا رسولؐ کا مزاج شناس تصور کر لے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرے اور جسے چاہے رد کر دے یا کوئی

عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مختلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کر دے کہ ہیں نے اس ہیں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے تو یہ مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے ۔۔۔ ہم انشاءاللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنت رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

(جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث صـ۶۳)

لیکن اگر ہم "مزاج شناس" کی شرط کو تسلیم نہ بھی کریں اور یہ کہدیں کہ نہیں۔ جن احادیث کو عام طور پر صحیح سمجھا جاتا ہے انہیں معیار قرار دے لیا جائے گا تو اول تو (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) احادیث کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جو کم از کم تمام سنّیوں کے نزدیک صحیح ہو۔ لیکن اس مقام پر آپ کیا کریں گے جہاں ایک مسلّمہ حدیث، قرآن کے خلاف جاتی ہو۔ مثلاً وصیت کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا ۨالوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف۔ حقا علی المومنین۔ (۲/۱۸۰)

جب کسی کی موت کا وقت قریب ہو اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو اس پر فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے والدین اور اقربا کے لئے وصیت کرے۔ مومنوں پر یہ بات فرض قرار دی گئی ہے۔

اس حکم خداوندی میں، والدین اور اقربا کے لئے پورے کے پورے مال میں وصیت کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ اور فرض بھی ایسا کہ آیت کے شروع میں اسے فریضہ کہا گیا ہے اور آیت کے آخر میں اسے پھر دہرایا گیا ہے۔ دوسرے مقام پر بڑی وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ وصیت کس طرح لکھائی جاتی ہے گی (۵/۱۰۶-۱۰۸) پھر جن آیات میں وراثت کی تقسیم کے حصے بیان کئے گئے ہیں وہاں، واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ یہ تقسیم من بعد وصیۃ ہوگی۔ یعنی متوفی کی وصیت پوری کرنے کے بعد، اگر کچھ مال باقی بچ جائے، تو اس کی تقسیم یوں ہوگی۔ (۴/۱۱-۱۲)

فرمایئے کہ اس باب میں اس سے واضح تر الفاظ میں کچھ کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ لیکن ایک حدیث (صرف ایک حدیث) کی رو سے کہا جاتا ہے کہ وصیت تہائی مال سے زیادہ میں نہیں کی جا سکتی اور وہ بھی غیر وارثوں کے لئے کی جا سکتی ہے۔ ورثاء کے لئے نہیں۔

اب دیکھئے۔ یہ حدیث کھلے طور پر قرآن کی نص صریح کے خلاف ہے۔ ہم ارباب متعلقہ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب دستور پاکستان کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی قانون ایسا نہیں بنے گا جو کتاب و سنت کے

خلاف ہو، تو آپ وصیت کے متعلق ایسا قانون کس طرح بنا سکیں گے جو کتاب کے بھی مطابق ہو، اور سنت کے بھی۔ اگر آپ کتاب کے مطابق قانون بنائیں گے تو وہ سنت کے خلاف چلا جائے گا۔ اور اگر سنت کے مطابق بنائیں گے تو وہ کتاب کے خلاف ہوگا۔ اس دشواری کے پیشِ نظر، یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ جب ایسی صورت آ پڑے تو اس وقت قرآن کے حکم کو منسوخ سمجھ لیا جائے اور عمل سنت کے مطابق کیا جائے۔ اس سلسلہ میں حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی اپنے کتابچہ ــــ فتنۂ انکارِ حدیث ــــ میں لکھتے ہیں۔

> رہی یہ بات کہ قولِ رسولؐ، قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے کتب علیکم ..... الخ اور رسول اللہ نے فرمایا لا وصیۃ للوارث۔ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا۔ اور قولِ رسولؐ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا۔ (ص۸۵)

واضح رہے کہ یہ کسی ایک شخص کا ذاتی عقیدہ نہیں۔ قانونِ شریعت یہی ہے کہ حدیث کا فیصلہ حجت ہے اور قرآن کا حکم منسوخ۔

اس سے پہلے اس قسم کے مسائل "علمائے کرام" سے متعلق سمجھے جاتے تھے، یا زیادہ سے زیادہ علمی اور نظری تحقیق کے متعلق مباحث۔ لیکن اب ان کی حیثیت یہ نہیں رہی۔ اب یہ ہماری مملکت سے متعلق عملی مسائل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس لئے ان کا حل اربابِ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، سنت کے متعلق جب تک یہ بنیادی سوال حل نہیں ہوتا، ملک میں کوئی قانون بن ہی نہیں سکے گا۔ اس وقت ہو یہ رہا ہے کہ ملک میں جو قانون نافذ ہوتا ہے یا حکومت جو اصلاحی قدم اٹھاتی ہے، اس کے متعلق بحث شروع ہو جاتی ہے کہ وہ شریعت کی رُو سے جائز ہے یا ناجائز۔ یہ بحث انفرادی طور پر شروع ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اس کے حق میں حدیثیں (یا فقہاء کے اقوال) پیش کرتے ہیں، دوسرے اس کے خلاف یہی کچھ کرتے ہیں۔ اور تماشہ یہ کہ حکومت خاموش ان بحثوں کو دیکھتی رہتی ہے، گویا اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ از روئے دستورِ پاکستان، اس کا فیصلہ حکومت کو کرنا چاہیئے۔ یہ بحثیں انفرادی طور پر چلتی رہتی ہیں اور ملک خلفشار کی نذر ہوتا رہتا ہے۔ یہ سب اس لئے کہ دستورِ پاکستان میں یہ تو لکھ دیا گیا ہے کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ لیکن اس میں نہ کہیں "سنت"

کی تعریف (DEFINITION) دی گئی ہے نہ اس کی تصریح کی گئی کہ یہ سنت ملے گی کہاں سے؟ اسی آئین کی رُو سے جس میں قانون سازی کے لئے یہ اصول مقرر کیا گیا ہے، اسلامی مشاورتی کونسل اور ادارہ تحقیقات اسلامی بھی وجود میں آچکے ہیں۔ ان پر لاکھوں روپے ماہانہ خرچ ہو رہے ہیں۔ لیکن ان سے اس وقت تک اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ دستور پاکستان کی اس بنیادی شق کی وضاحت کر دیں۔ صدر مملکت نے (سنہ ۱۹۶۰ میں) ادارہ تحقیقات اسلامی کے گورنروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> بیس تیس برس کے بعد کوئی شخص تمہاری آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا جب تک تم ایسی بات نہ کہو گے جو عقلِ عامہ کو اپیل کرے اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے۔

بیس تیس برس کا عرصہ تو بہت لمبا ہوتا ہے، لوگوں کی نگاہوں میں آج بھی ان اداروں کی حیثیت "سفید ہاتھیوں" سے زیادہ نہیں رہی۔

بہرحال، ہم محترم مرکزی وزیر قانون سے گزارش کریں گے کہ وہ مجوزہ بورڈ سے کہیں کہ وہ دستور پاکستان کی اس سب سے اہم شق کے متعلق ایسی وضاحت کر دیں جس سے اس ملک میں قانون سازی ممکن العمل ہو اور قوم کی کشتی موجودہ گرداب سے نکل کر جانبِ منزل رواں ہو سکے۔

پرویز صاحب کے
درس قرآن کریم کا سلسلۂ نو

پہلا درس ۱۷ مارچ کو ہوا تھا جس میں قرآن کریم کا ابتدائی تعارف پیش کیا گیا تھا۔ اسکے بعد

الحمد سے باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگا

ہر اتوار کی صبح ۹ بجے

۲۵ بی۔ گلبرگ ۲ میں ——— خواتین کیلئے پردہ کا خاص انتظام ہوگا۔

(نمائندہ بزم طلوع اسلام)

تصحیح

طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۶۸ء میں "اسلامک سوشلزم" کے عنوان کے تحت صفحہ ۲۳ پر آپ کو حسب ذیل عبارت نظر آئے گی۔

آخری چیز ..... وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔

یہ درحقیقت اس اقتباس کے شروع اور آخر کے الفاظ ہیں جو اس جگہ دیا جانا چاہیئے تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ سہو کتابت کی وجہ سے وہ اقتباس نہ دیا جا سکا جس کی وجہ سے مضمون بے معنی ہو کر رہ گیا۔ وہ اقتباس حسب ذیل ہے:۔

"آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے، یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کس نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے، جائز[1] راستے سے آئے، جائز طریقے پر استعمال ہو، جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق[2] اس پر عاید کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اسکے بعد جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست کرو، اسی طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے کر رہے ہو۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اسمیں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسولؐ کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔"

---

[1] جائز سے مراد ہے اس قانون شریعت کی رُو سے جائز جو اس نظام سرمایہ داری کا وضع کردہ ہے۔ (طلوع اسلام)

[2] یہ حقوق صدقہ اور خیرات کی رُو سے ادا ہو جاتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

درسِ اوّل

قرآن کریم کے سمجھنے کا طریق

پرویز

۱۷ اتوار - ۱۷ مارچ ۱۹۶۵ء سے پرویز صاحب کے ہفتہ واری درس قرآن کریم کے نئے سلسلہ کا آغاز ہوا۔ پہلے درس میں انہوں نے قرآن مجید کا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ اس کے سمجھنے کا طریق کیا ہے۔ درس گاہ ارباب شوق سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اور جذب و کیف کا یہ عالم کہ ڈیڑھ گھنٹہ کے اس خطاب میں،

مژہ برہم مزن تا شکنی رنگِ تماشا را

کا محسوس مظاہرہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ درس اس قدر حقائق پرور اور دل نشین تھا کہ اس کے خاتمہ پر ہر طرف سے اصرار ہوا کہ اسے ضبطِ تحریر میں لا کر اسکی عام اشاعت کی جائے۔ احباب کے اس اصرار کے پیشِ نظر اس درس کو ٹیپ ریکارڈر سے منضبط کیا جاتا ہے۔ واللہ المستعان!۔

❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ گرامی قدر! سلام مسنون۔

آپ کو، درسِ قرآن حکیم کے سلسلہ زریں کا آغاز نو مبارک ہو۔ کس قدر خوش بخت ہیں وہ محفلیں جن میں خدا کی اس کتابِ جلیل و عظیم کا تذکرۂ جمیلہ وجہ کشادِ قلب و نگاہ ہو۔ دعا ہے کہ خدا آپ احباب کے اس پاکیزہ ذوق میں برکت عطا فرمائے۔

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے درس کے سابقہ سلسلہ کے اختتام پر عرض کیا تھا، میں قرآن کریم کا

ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ اس سے زیادہ نہ میری کوئی پوزیشن ہے نہ کوئی دعوے۔ میں نے عمر بھر اس کتابِ عظیم کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا ہے۔ اور ایسا کہتے ہیں، میں کسی مبالغہ سے کام نہیں لے رہا۔ قریب پانچ برس کا تھا کہ مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ اس وقت سے آج تک — کہ میری عمر پینسٹھ برس کے قریب ہونے کو آئی ہے — بجز ان دنوں کے جن میں کسی وجہ سے معذور ہو گیا ہوں، شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جب قرآن مجید میرے سامنے کھلا نہ ہو۔ عمر کے پہلے مرحلہ میں، قرآن کا مطالعہ اسی قدیم انداز سے کیا جیسا ہمارے ہاں ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس کے بعد، جب میرے شعور نے آنکھ کھولی تو یہ دیکھا کہ اس طریق سے، جو کچھ قرآن سے سمجھا تھا وہ حقیقت سے بہت دور تھا۔ اس کے بعد میں نے قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کی کوشش کی، اور میں (فخریہ نہیں، بلکہ بطور تحدیثِ نعمت) یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ قرآن کریم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کی صداقت پر مجھے علیٰ وجہ البصیرت قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، یقین نہ حاصل ہو۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔ قرآن حکیم کو اس طرح سمجھ لینے کے بعد، مجھ پر یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ — دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دوں۔ چنانچہ قریب تیس سال سے مسلسل، میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں، اپنی بساط کے مطابق، مصروف تگ و تاز ہوں۔ میرا ہفتہ واری درس، اسی پروگرام کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس سلسلہ کو میں نے (غالباً) ۱۹۵۵ء میں کراچی میں شروع کیا تھا۔ (اس سے پہلے دہلی اور شملہ میں متفرق خطابات کے ذریعہ اس فریضہ کو سرانجام دیتا تھا)۔ اور یہ سلسلہ بعونہٖ تعالیٰ، آج تک جاری ہے۔ درس کا پہلا سلسلہ، آٹھ سال کے بعد، گذشتہ دسمبر میں تکمیل تک پہنچ گیا تھا۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اس گراں بار ذمہ داری سے میں سبکدوش ہو گیا ہوں۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ

مکتبِ عشق کا انداز نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

اربابِ شوق کے اصرار پیہم کے پیشِ نظر، اس سلسلہ کو از سرِ نو شروع کرنا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفر میں کوئی مقام بھی ایسا نہیں آسکتا جسے آخری منزل کہا جا سکے۔ ان وادیوں میں تو بانگِ درا رہروؤں کو پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلسلۂ نو کا آغاز بہم بہار کے موسم سے کر رہے ہیں جب حیاتِ تازہ اپنی نمود کے لئے مضطرب و بے قرار ہوتی ہے اور شاخوں کے پردوں میں چھپی ہوئی رعنائیاں، مستانہ وار ابھر اور نکھر کر دعوتِ

شادابیٔ عالم بن جاتی ہیں۔ چہ عجب کہ وہ قرآنی حقائق، جو سلسلۂ اول میں ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رہ گئے تھے، اس دفعہ بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آجائیں۔

سلسلۂ اول میں، میرا انداز زیادہ تر خطیبانہ تھا۔ لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ درس کا اسلوب معلمانہ رکھوں اور قرآن کریم کو ایک نصاب کی کتاب کی طرح آپ احباب کے سامنے پیش کروں۔ یعنی اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح کرتے ہوئے متعلقہ آیت کا مفہوم متعین کر دیا جائے اور پھر اس آیت کا ربط دیگر آیات کے ساتھ قائم کرتے ہوئے قدم بقدم آگے بڑھتے چلے جائیں۔ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔ میں اس شوقِ بے پایاں اور آرزوئے بیکراں کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

لفظ قرآن کا مفہوم

لفظ قرآن کا مادہ (ق - ر - ء) ہے۔ عربی زبان میں مادہ کسے کہتے ہیں اور اس کی خصوصیت کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ اس مادہ (ق - ر - ء) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں — جمع کرنا اور محفوظ رکھنا — سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "جمع" اور "حفظ" بھی تو عربی زبان کے الفاظ ہیں اور خود قرآن نے انہیں استعمال بھی کیا ہے تو پھر (ق - ر - ء) کے مادہ میں کیا خصوصیت ہے کہ قرآن کا لفظ، اس مادہ سے لیا گیا، جمع اور حفظ سے نہیں۔ قرآن کا ایک اعجاز لفظوں کا انتخاب ہے، اور اس کا یہ انتخاب خود پکار کر کہہ دیتا ہے کہ

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

(ق - ر - ء) کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اس طرح جمع اور محفوظ رکھنا جس طرح رحم میں نطفہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رحم میں نطفہ اس طرح محفوظ نہیں رکھا جاتا جس طرح (مثلاً) کسی تھیلی میں چنے محفوظ رکھے ہوں۔ وہ سکے، جامد ہوں گے اور ویسے کے ویسے پڑے رہیں گے۔ لیکن رحم میں نطفہ جامد نہیں ہوتا۔ اس میں بڑھنے، پھولنے، پھلنے، نشوونما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ قرآن کریم، تمام نوع انسان کے لئے، قیامت تک، ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے (اور ہے) کہ یہ انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلا جائے۔ یہ ہر زمانے میں انسانی فکر کی امامت کا فریضہ سر انجام دے۔ یہ کاروانِ انسانیت کے لئے ہر منزل میں چراغِ راہ ہو۔ یہ کسی مقام پر بھی یہ نہ کہہ دے کہ مجھ میں

اب آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مقام اسی ضابطہ ہدایت کو حاصل ہو سکتا ہے جس کے مفہوم میں، علمِ انسانی کی نسبت سے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت ہو۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے ان حسین و بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ (۴۱/۵۳)

ہم نوعِ انسان کو اپنی نشانیاں عالم انفس و آفاق میں دکھلاتے چلے جائیں گے تاآنکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔

یعنی جوں جوں انفس و آفاق میں پوشیدہ حقیقتیں بے نقاب ہوتی جائیں گی قرآن کی صداقت اور نکھر اور ابھر کر سامنے آتی جائے گی۔ انسانی علم کی ہر تحقیق۔ سائنس کا ہر انکشاف قرآنی دعاوی کی شہادت بنتا چلا جائے گا۔ دوسرے مقام پر اس نے کہا ہے کہ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ۝ - چونکہ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس لئے وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۝ (۳۸/۸۸) - اس میں بیان کردہ حقائق، سب کے سب، ایک ہی وقت میں سامنے نہیں آجائیں گے۔ یہ کچھ وقت کے بعد بے نقاب ہوں گے۔

یہ ہے لفظ قرآن کی، مادہ کے اعتبار سے خصوصیت۔ بعض ماہرینِ لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے اور اس کے معنی ہیں اعلانِ عام (PROCLAMATION) اس اعتبار سے قرآن کے معنی ہوں گے ملکتِ خداوندی کا اعلامیہ۔ وہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ تو اس کے معنی ہوں گے ۔۔۔ اٹھ۔ اور دنیا میں اس خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعلان عام کر دے جس نے کائنات اور انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اس حقیقت کا اعلان کہ انسانوں کی ربوبیت (پرورش) انسانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گی۔ یہ اس خدا کے نظام کی تحویل میں رہے گی جس نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان کی نشوونما کا ذمہ لیا ہے۔

کیسا انقلاب آفریں ہے خدا کا یہ اعلان!

کتاب خدا نے قرآن کو کتاب بھی کہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ک۔ ت۔ ب) ہے جس کے معنی حکم دینے یا کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کُتِبَ

عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ۔ (تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں)۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ۔ تم پر عند الضرورت جنگ کرنا قانوناً لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے "کتاب" کے معنی ضابطہ قانون کے ہوں گے۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو ان معانی میں خود استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں پہلے تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رو سے کون کون سے رشتے تم پر حرام ہیں۔ اور اس کے بعد کہا كِتَابَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (۴/۲۴)۔ یہ تمہارے لئے خدا کا قانون ہے۔ اسی جہت سے قرآن کے متعلق کہا کہ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸/۳)۔ اس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔

قوانینِ فطرت

اس مقام پر ضمناً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ دنیا میں قوانین (LAWS) دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے وہ جن کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تمدنی زندگی سے ہوتا ہے۔ قوانین فطرت کے متعلق ہر صاحب علم (سائنٹسٹ) اس کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں۔ لیکن جہاں تک دوسری قسم کے قوانین کا تعلق ہے، مغرب کے سیکولر نظام کی عمارت اس مفروضہ پر استوار ہوتی ہے کہ انسانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ان قوانین کو خود وضع کریں۔ لیکن قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے تحت انسانی معاشرہ کو فوز و فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ ان قوانین کے بنیادی اصول اور مستقل اقدار بھی (قوانین فطرت کی طرح) خدا ہی کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ یہ اصول و اقدار وحی کی رو سے ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ قرآن کریم نے جہاں انسانی زندگی سے متعلق قوانین کو کتاب اللہ سے تعبیر کیا ہے، وہاں اس نے قوانین فطرت کے لئے بھی یہی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثلاً سورۃ توبہ میں ہے

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ..... (۹/۳۶)۔

یہ حقیقت ہے کہ کتاب اللہ کی رو سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے اور یہ اس زمانے سے مقرر ہے جب خدا نے ارض و سمٰوٰت کو پیدا کیا تھا۔ یعنی جتنی مدت میں زمین، سورج کے گرد پورا چکر کاٹتی ہے، وہ ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے اور اس عرصہ کو بارہ پر تقسیم کر کے مہینوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ اس تقسیم کی رو سے ہر سال کا ہر مہینہ سابقہ سال کے اس مہینہ کے مطابق ہوتا ہے[1]۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں بات ہو رہی تھی قانونِ فطرت کی لیکن

---

[1] قرآن میں اس کی وضاحت کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ اس کی بابت متعلقہ مقام پر تفصیل سے بات کی جائے گی۔

اسے تعبیر کیا گیا ہے "کتاب اللہ" سے۔ اس کے بعد ہے مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ۔ ان میں سے چار مہینے ایسے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار دی گئی ہے ـــــ یہ قانون، انسانی معاشرہ سے متعلق ہے۔ اس کے بعد ہے ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (۹/۳۶)۔ یہ خدا کا دینِ قیم ہے۔ یعنی قوانینِ فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین دونوں کے مجموعہ کا نام دینِ قیم ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "کتاب اللہ" کے دو حصے ہیں۔ ایک صحیفۂ فطرت، جو خارجی کائنات میں بکھرا پڑا ہے۔ اور دوسرا صحیفۂ وحی، جس کا محفوظ اور مکمل مجموعہ قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم کی رو سے، یہ دونوں قوانین، خدا کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور دونوں کی پابندی ضروری ہے۔ قوانین فطرت کی پابندی سے فطرت کی قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں۔ اور قوانین وحی کی پابندی سے وہ قوتیں انسانی ذات کی نشوونما اور عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کی جاتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک ضابطۂ قوانین سے بھی اعراض برتا جائے تو زندگی کا اعتدال قائم نہیں رہتا اور کاروانِ انسانیت منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر قوانینِ فطرت سے اعراض برتا جائے تو دین مذہب میں تبدیل ہو کر خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (دنیا میں ذلت و خواری) کا موجب بن جاتا ہے۔ اور اگر مستقل اقدار خداوندی سے اعراض برتا جائے تو دنیا اس جہنم میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کے شعلے آج تمام اقوامِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ اس روشِ زندگی کو قرآن نے "کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ "کیا یہ لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہیں۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (۲/۸۵) جو ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ دنیا کی زندگی میں ذلت و خواری اس کے حصے میں آئے گی۔ اور قیامت میں وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا۔ تاریخ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ تسخیرِ فطرت اور مستقل اقدار کو جب بھی الگ الگ رکھا گیا، اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب میں تفریق

کتاب میں تفریق کا ایک پہلو تو یہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے ـــــ یعنی قوانینِ فطرت اور مستقل اقدار میں مغایرت پیدا کرنا۔ دوسرا گوشہ یہ ہے کہ خود قرآن کریم کے ایک حصہ پر عمل کرنا اور دوسرے سے اعراض برتنا۔ اس کا نتیجہ بھی ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم نے صدیوں سے یہی روش اختیار کر رکھی ہے اور اس کا خمیازہ بھگت

رہے ہیں۔ (مثال کے طور پر دیکھئے) کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ اور کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ دونوں یکساں احکام خداوندی ہیں۔ لیکن ہم کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ پر تو اس شدت سے عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ کو اپنی زندگی سے یکسر خارج کر رکھا ہے، حالانکہ مومن کی ساری زندگی مجاہدانہ عسکریت کی زندگی تھی۔ روزوں پر زور، اور عسکری تربیت سے اجتناب، یہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر کے مرادف نہیں تو اور کیا ہے۔

الحاد اتنا ہی نہیں کہ کتاب کے ایک حصہ پر عمل اور دوسرے سے مجرمانہ تغافل! قرآن تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ کسی ایک قانون یا صفتِ خداوندی کی پابندی میں اس قدر شدت اختیار کر لینا کہ اس سے دوسرے قوانین یا صفاتِ الٰہیہ نظرانداز ہو جائیں، اس کا نتیجہ بھی خوشگوار نہیں نکل سکتا۔ ایک جگہ اس نے کہا ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا (۴۱/۴۰)۔ جو لوگ ہمارے قوانین میں ایک طرف نکل گئے، ان کی یہ روش ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ دوسرے مقام پر ہے وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ (۷/۱۸۰)۔ جو لوگ صفاتِ خداوندی میں سے کسی ایک صفت کو لے کر اس میں ایک طرف دور تک نکل جائیں، ان سے تم کنارہ کشی اختیار کرو۔ (مثال کے طور پر) یہودی اور ہندو، خدا کی صفتِ عدل میں اس قدر متشدد ہو گئے کہ انہوں نے لغزش خوردہ انسان کے لئے بازآفرینی کا کوئی دروازہ ہی کھلا نہ رہنے دیا۔ دوسری طرف عیسائیت، اس کی صفتِ رحیمیت میں اس قدر متشدد ہو گئی کہ اس نے زندگی سے عمل کو یکسر خارج کر دیا اور ہر بات کو خدا کے رحم اور (GRACE) پر منحصر قرار دے دیا۔ قرآن کی رو سے دونوں روشیں بھی غلط تھی اور یہ بھی غلط۔ صحیح روش وہی ہے جو ان قوانین و صفات کی پابندی میں صحیح تناسب و توازن بدوش ہو۔ اسی کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ اسلام، الاسماء الحسنیٰ مختلف صفاتِ خداوندی کو پورا پورا توازن لئے ہوئے، (علیٰ حدِ بشریت) اپنے اندر منعکس کرنے اور عملی زندگی میں انہیں معیار قرار دینے کا نام ہے۔

اس وقت میں صرف، انہی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔ تفصیل اس اجمال کی اپنی اپنی جگہ آپ کے سامنے آتی جائے گی۔

یہ کتاب ہے قرآن کریم کو کتاب کہنے سے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا بھی مقصود تھا کہ یہ ایک کتاب ہے، اور جس طرح تم کسی کتاب کو پڑھتے ہو اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہو، اُسی طرح اسے بھی پڑھو اور اس سے مستفید ہو۔ آپ سوچیے کہ اگر آپ کو کوئی ایسی کتاب دیدی جائے، جس کی زبان سے آپ ناواقف ہوں تو آپ اُس کتاب کو کبھی نہیں پڑھتے۔ حتیٰ کہ اگر اُس کی زبان مشکل ہو تو بھی آپ اس کے دو چار صفحے پڑھ کر الگ رکھ دیتے ہیں، کہ اس کا معیار میری علمی سطح سے اونچا ہے۔

اگر اُس کتاب کا پڑھنا آپ کے لئے ضروری ہے تو آپ اُس کی زبان سیکھتے ہیں اور اپنے اندر اتنی استعداد پیدا کرتے ہیں جس سے وہ کتاب سمجھ میں آجائے، آپ کبھی یہ نہیں کرتے کہ آپ کتاب پڑھتے جائیں، خواہ وہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ دنیا کی کسی کتاب کے ساتھ آپ یہ نہیں کرتے۔ لیکن اس میں ایک استثنا رہے۔ اور وہ ہے قرآن کریم۔ اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اس کی زبان آتی ہو یا نہ آتی ہو، اسے پڑھتے رہنا چاہیئے اس سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جسے اس شدت اور کثرت سے پڑھا جاتا ہو، اور اس کے ساتھ ہی، دنیا کی کوئی اور کتاب ایسی نہیں جسے بے سمجھے پڑھا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لئے۔ یا یوں کہیئے کہ قرآن کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے۔ یہ ایک بڑی گہری سازش تھی جسے تقدس کا لباس پہنا کر مزین بنا دیا گیا۔ یوں قرآن کتاب نہ رہا، جنتر منتر کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ کتاب اور جنتر منتر میں فرق یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے الفاظ سمجھ کر پڑھے جاتے ہیں اور جنتر منتر کے الفاظ بلا سمجھے دہرائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قرآن کے الفاظ کے تعویذ لکھے جانے لگے۔ اس کی آیات کے ورد ہونے لگے اور اس کا نام رکھا گیا "اعمالِ قرآنی" اور ایسا کرنے والا کہلانے لگا "عامل"۔ سوچیئے کہ ہم اس کتاب کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ یاد رکھئے جب تک مسلمان قرآن کو کتاب نہیں سمجھتا وہ اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

مدوّن کتاب

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے شروع میں یہ کہہ دیا تھا کہ قرآن ایک کتاب ہے عربوں کے ہاں کتاب کا لفظ اس وقت بولتے تھے جب منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی کر کے ان میں لوہے کا کڑا پرو دیا جاتا تھا یا سلائی کر دی جاتی تھی — قرآن کو الکتاب کہنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صحیفۂ مقدسہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں ایک مرتب اور مدوّن کتاب کی شکل میں موجود تھا جس کی شیرازہ بندی بھی ہو چکی تھی۔ سورۂ الطور میں ہے

وَالطُّوْرِ ۙ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ (۵۲/۱-۳)

یعنی قرآن سطروں میں لکھی ہوئی کتاب تھی۔ پہلے اسے منتشر اوراق پر لکھا جاتا تھا اور بعد میں اسکی شیرازہ بندی کی جاتی تھی۔ عربوں کے ہاں ہرن کی کھال چھیل کر اُسے (PARCHMENT) کی شکل میں قرطاس بنا لیتے۔ اسے رَقّ کہتے تھے۔ جن تحریروں کو محفوظ رکھنا مقصود ہوتا۔ انہیں اس پر قلمبند کر لیتے تھے۔ جہاں تک کاتبین وحی کا تعلق ہے، سورۂ عبس میں ہے کہ قرآن کی کتابت بڑے باعزت اور قابل اعتماد کاتبوں نے کی تھی (۸۰/۱۵-۱۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں قرآن جمع اور مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تدوین بعد میں (منتشر ٹھیکریوں، ہڈیوں اور پتوں) کی مدد سے حضرت

ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمرؓ ——————— یا حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ وضعی ہیں جنہیں قرآن کی اہمیت اور خصوصیت کو نظروں سے گرانے کے لئے اختراع کیا گیا۔

مکمل و محفوظ اسی مرتب اور مدوّن کتاب کے متعلق کہہ دیا گیا کہ یہ کتاب مکمل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے اور وہ خود اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (۱۵/۹) یعنی خدا نے اس کی تصریح فرما دی کہ

(۱) قرآن کریم ایک مرتب کتاب کی شکل میں رسول اللہؐ کے زمانے میں موجود تھا۔

(۲) یہ ہر طرح سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔

(۳) یہ قیامت تک کے لئے محفوظ رہے گا۔

ختمِ نبوت اس سے آپ، علاوہ دیگر امور، اس حقیقت کو بھی دیکھ لیں گے کہ قرآن کریم نے ختم نبوت کی حقیقت کو کس طرح واضح کر دیا ہے۔ جب ایک ایسا ضابطۂ حیات جو تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک کے لئے مرتب اور محفوظ شکل میں دیدیا گیا ہو اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی بھی نہ کر سکتا ہو تو ایسی کتاب کی موجودگی میں کسی نبی یا رسول کے آنے کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ قرآن کی ابدیت، اکملیت اور عالمگیریت خود ختم نبوت کی دلیل ہے۔ قرآن کی نصِ صریح کی رو سے کوئی نبی یا رسول بغیر کتاب کے نہیں آیا۔ لہٰذا جب خدا کی طرف سے آخری کتاب دی جائے تو اس کا لانے والا خود بخود آخری رسول ہو جائے گا۔

زبانِ عربی قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (۲۶/۱۹۵)۔ اس کتاب کی زبان عربی مبین ہے۔ خود لفظ "عربی" کے معنی بھی فصیح اور واضح کے ہیں۔ اور جب اس کے ساتھ "مبین" کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کے واضح تر ہونے میں شبہ کیا رہ جاتا ہے۔ یہ کتاب واضح ہے اور غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (۳۹/۲۸)۔ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں، ابہام نہیں، التباس نہیں ــ صاف نکھری سیدھی، واضح، کتاب روشن۔ حتیٰ کہ قرآن کو نور بھی کہا گیا ہے۔ یعنی خود روشن اور دنیا کو روشن کرنے والی کتاب۔

یوں تو قرآن کی زبان، عربی کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ خدا نے اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جاتا ہے، اس رسول کا پیغام اسی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہؐ کے اولین مخاطب عرب تھے، اس لئے قرآن انہی کی زبان میں آیا۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مشیت کا

پروگرام کچھ ایسا تھا کہ وہ زبان جس میں قرآن نازل ہونا تھا ایسی جامع، عمیق اور وسیع ہو کہ وہ قرآنی حقائق کی متحمل ہوسکے۔ علم الالسنہ کے ماہرین بتلاتے ہیں کہ اس باب میں دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے (حضرت اسمٰعیلؑ) کو ذبح کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے تو خدا نے انہیں بیٹے کے حلق پر چھری چلانے سے روک دیا اور کہا کہ ہم اسے ایک عظیم قربانی کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے تھے اور باپ کی مملکتِ عظیم کا انہی کو وارث ہونا تھا۔ لیکن حکم یہ دیا گیا کہ انہیں حجاز کی وادی غیر ذی زرع میں بسا دیا جائے تاکہ یہ وہاں خانۂ خدا کی تولیت کا فریضہ سرانجام دیں۔ اور مملکت شام کی سرداری حضرتِ اسحاقؑ کو دے دی جائے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرتِ اسحاقؑ کی اولاد (بنی اسرائیل) امور جہانبانی میں مصروف رہی۔ اس کے حصے میں شوکت سلیمانیؑ اور سطوتِ داؤدیؑ آئی۔ لیکن بنی اسمٰعیل اسی وادیِ غیر ذی زرع میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے، انہوں نے نہ کوئی حکومت قائم کی اور نہ ہی کسی تہذیب و تمدن کی بنا ڈالی۔ یہ ایک ہی کام کرتے رہے۔ یعنی عربی زبان کی تشکیل، تعمیر اور تہذیب۔ انہوں نے اس زبان کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ دنیا کی کوئی زبان اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ ڈاکٹر (BUCKE) نے اپنی کتاب (COSMIC CONSCIOUSNESS) میں مشہور مستشرق (MAX MULER) کی تحقیقات کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس زمانے میں تمام انڈو یوروپین زبانوں میں مادی تصورات ROOT CONCEPTS کی تعداد ایک سو اکیس تک پہنچی تھی، عربوں کے ہاں صرف اونٹ کے تضمنات میں پانچ ہزار سات سو چوالیس[5744] الفاظ موجود تھے۔ اس سے اس زبان کی وسعتوں کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ یہ بڑی سائنٹفک زبان ہے، اس میں ایک مادہ (ROOT) ہوتا ہے جو عام طور پر تین حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے اس مادے کے معانی میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے جو ان تمام الفاظ میں جھلکتی چلی جاتی ہے جو اس مادے سے مختلف ابواب میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مادوں کی تعداد (۲۵۰۰) کے قریب ہے۔ آپ اندازہ کر لیجئے کہ ان مادوں سے جو الفاظ بنائے گئے ہوں گے ان کی تعداد کس قدر ہوگی۔

یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن نازل ہوا، چونکہ یہ بڑی سائنٹفک واقع ہوئی ہے اس لئے اس کا سیکھنا بڑا آسان ہے۔ یہ جو اس زبان کو ہوا بنا کر رکھ دیا گیا ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمان قرآن کو براہ راست سمجھنے نہ لگ جائیں اور یہ خاص طبقے کی اجارہ داری رہے۔ خود قرآن کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (۵۴/۱۷)

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنایا ہے۔ دوسری جگہ ہے

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۙ (۴۱/۳) ۔ ایک ایسی کتاب ہے، جس کی آیات کو نکھار کر الگ الگ کر کے واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ قرآن ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں ایک واضح ضابطہ حیات بن گیا۔ یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) ہے۔ یعنی جن امور کا ذکر اس میں کیا گیا ہے، انہیں بڑی وضاحت سے کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

تصریفِ آیات

قرآن کے نازل کرنے والے خدا نے کہا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵/۱۹) قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمہ ہے۔ اس کے لئے طریق کیا اختیار کیا گیا ہے، یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کا انداز عام کتابوں جیسا نہیں۔ عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں کتاب مختلف ابواب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ہر باب کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے اور اس موضوع سے متعلق تعلیم اس باب کے تحت مربوط طور پر دیدی جاتی ہے۔ قرآن اس طرح کی تصنیف کردہ کتاب نہیں۔ وہ یوں سمجھئے جیسے تیئیس سال میں عطا فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر آئی ہے۔ اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر ہے۔ تفصیل کسی اور جگہ ہے۔ استثناء کسی اور سورۃ میں۔ نیز مختلف حقائق کو مختلف واقعات کے ضمن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اسے تصریفِ آیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانا۔ سورۂ انعام میں ہے

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۶/۱۰۵)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں مختلف آیات کو پھیر پھیر کر اس لئے لایا گیا ہے کہ بات اس طرح واضح ہو جائے جیسے چھلکا اور مغز الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور یوں بات نکھر اور ابھر کر سامنے آجائے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔

(۱) محاورۂ عرب۔ یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں عربی زبان کے اُن الفاظ کا جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں جو مفہوم عرب لیتے تھے، اس سے واقفیت اور

(۲) قرآن پر اتنا عبور کہ جو بات کسی ایک آیت میں کہی گئی ہے، یہ چیز بیک وقت آپ کے سامنے آجائے کہ اس کے متعلق قرآن کے دیگر مقامات میں کیا آیا ہے۔

تدبّر فی القرآن

لیکن ان دونوں شرطوں سے زیادہ اہم ایک اور شرط بھی ہے اور وہ ہے تدبّر فی القرآن (۴/۸۲)۔ یعنی قرآن کے سمجھنے میں غور و فکر سے کام لینا۔ آپ قرآن کریم کے ورق الٹیئے۔ قریب قریب ہر صفحے پر آپ کو علم و بصیرت اور عقل و شعور سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی تاکید ملے گی۔

تدبر کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لئے ہے نہ کسی خاص زمانے کے لئے۔ وہ تمام افراد کے لئے ہے اور تمام زمانوں کے لئے۔ اس لئے قرآن کو تقلیداً سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ نہ ہی کسی ایک فرد کا تدبر و تفکر دوسرے کے لئے سند اور حجت ہو سکتا ہے۔ قرآن پر غور کرنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانے میں جس سطح تک علم انسانی پہنچ چکا ہے اُس پر اُس کی نگاہ ہو۔ قرآن انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہی معلوم نہ ہو کہ اس کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں تو وہ قرآن سے راہ نمائی کیا حاصل کر سکے گا؟ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح ایک فرد کا تدبر فی القرآن دوسرے کیلئے سند اور حجت نہیں ہو سکتا اسی طرح جو کچھ قرآن کے متعلق کسی ایک زمانے میں سمجھا گیا ہو وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائے گا، نت نئے قرآنی حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں

قرآن میں ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ٥ (۴/۸۲)۔ کیا ان لوگوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کئی اختلاف پاتے۔ یعنی قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں۔ اور یہ چیز اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں تو کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کی تعبیرات (INTERPRETATIONS) مختلف ہو سکتی ہیں۔ آپ سوچیئے کہ لفظی اختلافات کا نہ ہونا بھی کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کا اس تحدی سے ذکر کیا جاتا؟ بات تو ساری تعبیرات کی ہے۔ اگر کسی کتاب کی عبارت کی کیفیت یہ ہو کہ وہ زید کو کوئی مفہوم دے اور بکر کو اس سے بالکل متضاد مفہوم، تو کیا اہلِ علم کے نزدیک اس کتاب کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے؟۔ قرآن سمجھنے کے لئے جو شرائط قرآن نے مقرر کی ہیں، اگر اُن کے مطابق قرآن میں تدبر کیا جائے تو اس کے کسی حکم کی دو تعبیریں ہو ہی نہیں سکتیں۔

اس مقام پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآن کریم میں کچھ تو احکام و قوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق ــــ احکام و قوانین کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے معانی متعین اور ٹھوس (CONCRETE) ہیں۔ لیکن حقائق ــــ بالخصوص وہ حقائق جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے ــــ انہیں تشبیہات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اہلِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ تشبیہات و استعارات سے ہر شخص اپنے اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق مشبہ بہ کے متعلق تصور قائم کر سکتا ہے۔ ان تصورات میں اختلاف ہوگا۔ لیکن جہاں تک قرآنی ہدایات کا تعلق ہے ان کی دو تعبیریں

نہیں ہو سکتیں۔ یہ احکام و قوانین اسلامی نظام کی طرف سے نافذ ہوں گے، اس لئے ان کی عملی جزئیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہو گا۔ یوں اُمت میں وحدت فی العمل پیدا ہو جائے گی۔ اور قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے فکری آزادی بھی برقرار رہے گی۔

تطہیرِ فکر و نظر

لیکن ان تمام شرائط سے کہیں زیادہ گہری شرط ایک اور ہے اور وہ یہ کہ جب تک اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصورات سے پاک نہیں کر لیا جائے گا، قرآن سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝ (۵۶/۷۹)۔ قرآن کا واضح ارشاد ہے یعنی جس کے قلب و نگاہ، انسانی خیالات کی آمیزشوں سے، پاک نہ ہوں اسے قرآن سے کوئی مس نہیں ہو سکتا۔ انسانی قلب خدا کا مسکن بن نہیں سکتا جب تک اس حریم کعبہ سے انسانی فکر کے تراشیدہ بتوں کو نکال باہر نہ کیا جائے۔ جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اسے اپنے اس خیال کی (کسی نہ کسی طرح) تائید مل جائے، اُسے قرآن کی بارگاہ سے بُری طرح جھٹکا رہتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اہلِ عرب کی زبان تو عربی ہے، وہ بھی قرآن کو صحیح طور پر کیوں نہیں سمجھ پاتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی قرآن کو (غیر عرب مسلمانوں کی طرح) تقلیداً سمجھتے ہیں۔ یعنی کسی زمانے میں کسی شخص نے جس طرح قرآن کو سمجھا، وہ آنے والوں کے لئے سند اور حجت بن گیا۔ اس کے بعد یہ سوال ہی نہ رہا کہ قرآن میں خود غور و فکر کیا جائے۔ یہ تقلیدی قرآن، عربوں کو عربی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور غیر عربوں کو ترجموں کے ذریعے اُن کی اپنی زبان میں۔ اپنی فکر سے نہ یہ قرآن کو سمجھتے ہیں نہ وہ --- اس لئے اس باب میں عرب اور عجم کی کوئی تفریق ہی نہیں رہی۔ تفسیر کی جو کتابیں الازہر میں پڑھائی جاتی ہیں وہی دیوبند (یا اب کراچی، ملتان اور لاہور کے دارالعلوموں) میں زیرِ تدریس رہتی ہیں۔ اپنی فکر و بصیرت نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ قرآن سمجھنے کے لئے سوال اہلِ زبان ہونے کا نہیں۔ سوال زبان دانی کے بعد اہلِ فکر و نظر ہونے کا ہے۔

احادیث کی رو سے قرآن فہمی

کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کریم کو احادیث کی مدد کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا کیونکہ رسول اللہ (صلعم) قرآن کے بہترین اور اعلیٰ ترین مفسر تھے۔ (نظر بظاہر) یہ بات بڑی معقول دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے کہ جب کسی آیت کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ نے اس کی تفسیر یہ بیان فرمائی تھی تو وہ کون سا مسلمان ہے جو اس بات کو زبان تک لانا تو ایک طرف،

اس کا تصور تک بھی کر سکتا ہو کہ اس کی تفسیر رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفسیر سے بہتر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفسیرِ قرآنی کہیں موجود بھی ہے؟ احادیث کی کتابوں میں ایک باب تفسیرِ قرآن کا بھی ہوتا ہے لیکن اس میں مختلف سورتوں کی دو دو چار چار آیتوں کی تفسیر ہوتی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ احادیث کی کتابوں میں تین قسم کی روایات قابلِ اعتماد نہیں ــــ پیش گوئیوں سے متعلق، لڑائیوں سے متعلق، تفسیر سے متعلق۔ اُن کے اس قول کی تصدیق خود اس تفسیر سے ہو جاتی ہے جسے کتبِ روایات میں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں سورۂ بقرہ کی تفسیر کی ابتداء اس آیت سے ہوتی ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا اور اس کی تفسیر حسبِ ذیل ہے۔

حضرت انس ابن مالکؓ۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سب مسلمان جمع ہو کر مشورہ کریں گے کہ آج کے دن ہم کسی کو اپنا شفیع بنائیں اور آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ سب کے باپ ہیں آپ کو اللہ نے ملائکہ سے سجدہ کرایا ہے اور آپ کو تمام نام سکھائے ہیں آپ ہماری شفاعت کریں تاکہ ہم آج اس تکلیف سے راحت پائیں وہ کہیں گے آج میں اس قابل نہیں اور اپنا گناہ یاد کریں گے (خلافِ حکم درخت کا پھل کھا لیا تھا) اور اللہ سے شرمائیں گے اور کہیں گے تم نوحؑ کے پاس جاؤ ان کو اللہ نے سب سے پہلا نبی بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔ سب آدمی ان کے پاس آئیں گے وہ کہیں گے آج میں اس قابل نہیں اور اپنا گناہ یاد کر کے شرمائیں گے اور کہیں گے تم ابراہیمؑ خلیل اللہ کے پاس جاؤ سب کے سب ان کے پاس آئیں گے یہ بھی ایسے ہی کہیں گے اور کہیں گے تم موسیٰؑ کے پاس جاؤ اللہ نے ان سے باتیں کی ہیں اور توریت عطا فرمائی ہے وہ ان کے پاس آئیں گے یہ بھی کہیں گے میں آج کے دن تمہارا شفیع نہیں ہو سکتا اور اپنا گناہ یاد کر کے اللہ سے شرمائیں گے اور کہیں گے تم عیسیٰؑ کے پاس جاؤ وہ رسول اللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں جب ان کے پاس آئیں گے یہ بھی ایسے ہی کہہ دیں گے اور کہیں گے محمدؐ کے پاس جاؤ جن کے اللہ نے اگلے پچھلے سارے گناہ بخش دیئے ہیں وہ اس وقت میرے پاس آئیں گے میں ان کو اللہ کے پاس بخشوانے لے جاؤں گا اور اللہ کے حضور میں (داخلہ کی) اجازت طلب کروں گا تو مجھ کو (آنے کی) اجازت ملے گی تو جس وقت میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا اور اللہ جو بات میرے دل میں ڈالے گا وہ کہوں گا پھر (اللہ کی طرف سے) کہا جائے گا (اے محمدؐ) سر کو اٹھا اور سوال کر تاکہ عطا کیا جائے اور کہہ تیرا سنا جائے گا اور شفاعت کر قبول کی جائے گی۔ اُس وقت

میں سر اٹھاؤں گا اور جیسے اللہ نے مجھے تعلیم دی تھی ویسے ہی اس کی تعریف بجا لاؤں گا۔ پھر شفاعت کروں گا اس دفعہ ایک گروہ بخشا جائے گا۔ (یعنی مہاجرین اور انصار اور بڑے بڑے نیک بندے اولیاء اللہ شہداء) اور ان کو جنت میں بھیج دوں گا۔ پھر اللہ کی طرف آؤں گا اور دیکھ کر سجدے میں جاؤں گا اور شفاعت کروں گا۔ اس مرتبہ بھی ایک گروہ بخشا جائے گا۔ اسی طرح تیسری دفعہ پھر چوتھی دفعہ ایسے ہی شفاعت کروں گا۔ پھر اللہ سے کہوں گا کہ کوئی باقی نہیں رہا سوائے ان کے جن کو قرآن نے روکا ہے اور ان پر ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہنے کا حکم ہے۔ ابو عبداللہ بخاری کہتے ہیں یعنی جن کے بارے میں یہ آیت خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ہے۔

آپ غور کیجئے کہ کیا اس تفسیر سے متعلقہ آیت کا کچھ مفہوم بھی سمجھ میں آتا ہے۔

کتبِ احادیث میں بیان کردہ تفسیر کا عام انداز یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رسول اللہؐ کی انتہائی حکمتِ بالغہ تھی کہ حضورؐ نے اپنی احادیث کو خود مرتب کر کے اُمت کو نہ دیا۔ حضورؐ بے شک اعلم الناس تھے لیکن آپ نے جو کچھ اپنے اولین مخاطبوں کو سمجھایا ہوگا وہ تو بہر حال اُس زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی ہوگا۔ اگر حضورؐ ان باتوں کو محفوظ کر کے اُمت کو دیدیتے تو بعد میں آنے والوں کے لئے تدبّر فی القرآن کا دروازہ بند ہو جاتا۔ اب جن باتوں کو احادیثِ رسول اللہؐ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت وہ باتیں ہیں جنہیں حضورؐ کی وفات کے دو تین سو سال بعد بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے لوگوں سے سُن کر انفرادی طور پر جمع کیا گیا۔ یہ روایات منسوب الی الرسولؐ کہلا سکتی ہیں، احادیثِ رسول اللہؐ نہیں کہلا سکتیں۔ کیا معلوم ان میں کتنا کچھ حضورؐ کا اپنا ہے اور کتنا کچھ دوسروں کا ملایا ہوا ہے۔ احادیث کے مجموعوں کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کے مطابق ہیں اُنہیں ہم صحیح تسلیم کر سکتے ہیں لیکن جو قرآن کے خلاف ہوں، یا جن سے حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو، اُن کے متعلق ہم کہہ دیں گے کہ وہ رسول اللہؐ کی نہیں ہو سکتیں۔ پھر سُن لیجئے کہ میں رسول اللہؐ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتا۔ مذکورہ صدر معیار کی رو سے غلط روایات کے متعلق کہتا یہ ہوں کہ وہ رسول اللہؐ کی ہو نہیں سکتیں۔

شانِ نزول

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ جب تک قرآن کی آیات کا شانِ نزول معلوم نہ ہو قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ شانِ نزول سے مراد یہ ہوتی ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں کوئی واقعہ رونما ہوتا تھا اور جس سے متعلق قرآن کی کوئی آیت نازل ہو جاتی تھی۔ اوّل تو آپ دیکھئے کہ یہ تصور ہی قرآن کی ابدیت اور عالمگیریت کے منافی ہے۔ قرآن قیامت تک کے لئے، اور تمام نوعِ انسان کیلئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عالمگیر انسانیت کا کوئی تقاضا ایسا نہیں جس کے متعلق اس میں راہ نمائی نہ دی گئی۔ لیکن اگر اسکے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں انہی واقعات کے متعلق ہدایت دی گئی ہے جو رسول اللہؐ کے زمانے میں اتفاقاً رونما

ہو گئے تھے تو قرآن ایک مکمل ضابطۂ ہدایت کیسے ہو جائے گا؟ اس میں ان امور کے متعلق ہدایت مل نہیں سکے گی جو حضورؐ کے زمانے میں رونما نہیں ہوئے تھے۔ نیز اس سے یہ بات بھی لازم آئے گی کہ اگر رسول اللہؐ دس بیس برس اور زندہ رہتے تو اس عرصہ میں کچھ اور واقعات رونما ہوتے۔ اس صورت میں موجودہ قرآن میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ لہٰذا موجودہ قرآن کو (معاذ اللہ) ناقص بھی تصور کرنا پڑے گا۔ بنا بریں یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے کہ قرآنی احکام صرف اُن واقعات کے سلسلے میں نازل ہوئے تھے جو رسول اللہؐ کے زمانے میں ظہور پذیر ہوئے تھے۔ اور جب تک ان واقعات کا علم نہ ہو قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

یہ تو شانِ نزول کے عقیدہ کے متعلق اصولی بحث تھی۔ اب یہ بھی دیکھئے کہ شانِ نزول کی روایات کس قسم کی ہیں۔ سورۂ حجر میں ہے۔

وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ (۱۵/۲۴ — ۲۵)

آیت کا مفہوم واضح ہے کہ جو لوگ دنیا سے پہلے گذر چکے ہیں خدا انہیں بھی جانتا ہے۔ جو بعد میں جانیوالے ہیں وہ اُن سے بھی باخبر ہے۔ خدا ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ اس مضمون کی کئی اور آیات قرآن میں موجود ہیں۔ اب یہ دیکھئے کہ کتبِ احادیث کی رو سے اس آیت کی شانِ نزول کیا بیان کی گئی ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ

> ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسول اللہؐ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اسے نہ دیکھیں لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے سے اسے جھانکتے رہتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی۔

یہ روایت کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ میں نے اسے مثال کے طور پر اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ کتبِ احادیث میں شانِ نزول کی روایات کس قسم کی ہیں۔

ان تصریحات سے میرا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس اسلاف کا سرمایہ چلا آرہا ہے اُسے دریا بُرد کر دینا چاہیئے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے اُسے لینا چاہیئے جو قرآن کے مطابق ہو۔ —— جو چیزیں قرآن کے خلاف ہوں اُنہیں ہمارے فہمِ قرآنی کے راستے میں روک بن کر

کھڑا نہیں ہو جانا چاہیئے - ہمارے فہم کی آزادی اور پابندی کی حدود قرآن متعین کرتا ہے اور اُسی کو سند اور حجت ہونے کا حق حاصل ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ طریقہ جس سے میں نے قرآن سمجھا ہے اور اسی کے مطابق میں دوسروں کو بھی قرآن سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں - میرے درس کا یہی انداز رہا ہے اور اب بھی یہی انداز رہیگا۔ جو اربابِ ذوق اس طرح قرآن سمجھنا چاہیں وہ میرے درس سے مستفید ہو سکیں گے - لیکن جو اصولی طور پر اس طریق سے متفق نہ ہوں، انہیں اس درس سے ذہنی کشمکش اور قلبی ہیجان کے سوا کچھ نہیں ملے گا - جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، قرآن سے وہی فیضیاب ہو سکتا ہے - جو پہلے سے قائم شدہ نظریات و معتقدات کو الگ کر کے اس کی بارگاہ میں آئے - اگر درس میں بیان کردہ امور میں سے کوئی بات وضاحت طلب ہو تو اُس کے متعلق آپ ہفتہ کے دوران مجھے مطلع کر دیں - میں آئندہ درس میں اُس کی مزید وضاحت کر دیا کروں گا - لیکن یہ چیز وضاحت طلبی کے لیئے ہو، بحث و مناظرہ کی خاطر نہیں - ان باتوں کے لیئے نہ میرے پاس وقت ہوتا ہے، نہ میں انہیں مفید ہی سمجھتا ہوں - اسی لیئے اس کی یہاں اجازت نہیں دی جاتی - میں نے ان امور کی وضاحت اس لیئے بھی ضروری سمجھی ہے کہ جو حضرات آج پہلی بار تشریف لائے ہیں، اُنہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں درسِ قرآن کا انداز کیا ہوتا ہے اور اس میں شرکت کے آداب کیا؟

میں آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ہمیں اپنی کتابِ عظیم کے سمجھنے اور سمجھانے کے بعد اُس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

بابُ المراسلات

ایک قرآنی گھرانہ

حلقۂ طلوعِ اسلام، قرآنی بہن ثریا عندلیب سے بخوبی متعارف ہے۔ اور ان کے مرحوم رفیقِ حیات حبیب اللہ خان سے بھی، جن کا حال ہی میں ایک حادثہ سے انتقال ہوگیا۔ یہ دونوں (میاں بیوی) جشنِ تکمیل درسِ قرآن میں شرکت کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ ان کا بیٹا (تنویر سلمہٗ) ویسے تو سائنس کا سٹوڈنٹ ہے لیکن اس نے مصوری شوقیہ سیکھی ہے۔ ماں نے اس جشن کے لئے ایک تصویر بنانے کا آئیڈیا (IDEA) بیٹے کو دیا اور اسے (اسلام آباد) سے لکھا کہ۔

وہ تصویر ایسی بنانی ہے جس میں ایک طرف طلوعِ سحر ہوتی اس طرح دکھائی جائے جیسے ایک کتاب میں سے کرنیں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہوں جو دوسری طرف کے اندھیرے کو دور کر رہی ہوں۔ وہ تصویر ایسی ہو جس کا عنوان "آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی" رکھا جاسکے۔ یا "روشنی کا مینار"۔ یا جو اس شعر کے مصداق ہو

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے!

باپ کو معلوم ہوا تو اس نے اس آئیڈیا کی وضاحت (بیٹے کے نام خط میں) اس طرح کی:

میرے پیارے بیٹے تنویرا

السلام علیکم۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری امی ایک ایسی تصویر چاہتی ہیں کہ جس میں ایک طرف کتاب اپنی تابانیوں کے ساتھ (یعنی ایک CODE OF LIFE جیسا کہ قرآن مجید در اصل ہے) طلوع ہو رہی ہو۔ دوسری جانب دو حصے ہوں ایک وہ جہاں شعاعیں پڑ رہی ہیں اور یہ منور ہو چکا ہے۔ دوسرا وہ جہاں شعاعیں نہیں پڑیں اور ہنوز تاریکی میں ہے۔

منور حصے میں ایک ORDERLINESS ہو اور ایک جمال یا خوبصورتی۔ اس لئے کہ ایسے حصے میں انسان UNIVERSAL BROTHERHOOD کے نظریئے پر عمل کرینگے۔ انسان صلح جوئی سے رہینگے اور اپنی اپنی جگہ سب معزز اور ہمہ۔ اجتماعی کوشش سے تعلیم، زراعت، صنعت، صحت، سائنسی تحقیق غرضیکہ عمل کے ہر میدان میں INTENSELY کام کر رہے ہوں گے اور فطرت کی جن طاقتوں پر ان کا اقتدار ہوگا ان کو انسانیت کی بہتری کے کاموں پر EMPLOY کریں گے تاکہ معاشرہ اور بھی روشن ہو جائے۔ اس حصے کے انسان کا چہرہ بہت مطمئن، پُرامید اور روشن ہونا چاہیئے اور ساتھ ہی اللہ تعالےٰ کے احسان کے لئے THANKFUL ہونے کا انداز لئے ہوئے ہو۔

تاریک حصے میں سب کچھ ہو لیکن ORDERLINESS غائب ہو۔ وہاں بھی صنعت زراعت، تعلیم جیسی سب ہی ACTIVITIES ہوں لیکن ایک کی محنت کو دوسرا ہڑپ کر جائے اور محنت کرنے والا بغیر اس کے ماحصل کے رہ جائے۔ فطرت کی طاقتیں ہوں لیکن وہ آپس میں قوم اور ملک کے نام پر بٹی ہوئی انسانیت اپنی تباہی کے لئے استعمال کر رہی ہو (جیسا کہ آج ہو رہا ہے کہ دو قومیں اپنے ایٹم بموں سے ساری دنیا کو THREATEN کرتی رہتی ہیں۔ ایک حصہ انسانیت کو دوسرے پر ظلم ڈھا رہا ہو جیسا کہ VIETNAM میں ہو رہا ہے یا مشرقِ وسطےٰ میں ہوا۔ ایک امیر تو دوسرا غریب۔ امیر غریب کو غلام بنا کر رکھے ہوئے ہو یہاں کا انسان بہت پریشان ہو۔ کمر جھکی ہوئی۔ چہرہ پر بھوک۔ مفلسی، عدم اطمینان، بلکہ مایوسی کا REFLECTION ہو۔ مایوسی ہی نہیں بلکہ وہ اللہ سے شکایت کر رہا ہو کہ ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات!

یا یوں ہو کہ روشن حصے میں ایک انسان ہو جس کا پوز ایسا ہو کہ وہ ERECT ہو مطمئن ہو۔ پُرامید ہو، THANKFUL ہو۔ اور اس کا تخیل سامنے لایا جائے جس میں ایک سنورتی ہوئی دنیا حدِ نظر تک پھیلی ہوئی ہو۔ (یعنی جنت کا منظر)

دوسرے حصے کا انسان ایسا ہو کہ زندگی کی گراں باری سے کمر جھکی ہوئی، چہرہ مایوس اور اس کی نگاہوں کے سامنے SHRINKING اور تباہ ہوتی ہوئی دنیا جس کو آگ نے (یعنی نارِ جہنم نے) پہلے ہی لپیٹنا شروع کر دیا ہے (یعنی دوزخ کا منظر)

تمہاری امی نے مجھ سے ایسا نہیں کہا لیکن یہ میرا خیال ہے کہ وہ ایسا چاہتی ہیں۔ میں نے

اس لئے لکھا ہے کہ اگر تم تصویر بنانے لگو تو ممکن ہے کہ اس سے کوئی THEME تم کو سوجھ جائے۔

زیادہ پیار۔ والسلام

خیر اندیش۔ تمہارا باپ

حبیب اللہ خان

آپ نے غور فرمایا کہ ایک قرآنی نگاہ کا حامل باپ، بیٹے کو کیا سمجھا رہا ہے؟ یہ خط ۷ر نومبر کو لکھا گیا۔ اور ۱۲ر دسمبر کو یہ مردِ مومن آناً فاناً ایک حادثہ کا شکار ہو گیا ـــ اور یہ تمام تصورات ایک خواب بن کر رہ گئے جس کی تعبیر حسرت کے سوا کچھ نہیں۔ قرآنی گھرانے بھی کس قدر نورانی ہوتے ہیں۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات

تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

دعا ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کے بچوں کو ان کا سچا جانشین بنائے۔

شکوک ـــ شبہات ـــ اعتراضات

- پیدا ہوتے ہیں ـــ کس کے دل میں؟ ـــ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں!
- ان کا جواب آپ کے پاس کیا ہوتا ہے؟ ـــ ملّے کی شکن، گھرکی، لاحول۔
- کیا اس سے اُن کے شکوک رفع ہو جاتے ہیں؟ ....

اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ یہ شکوک رفع ہوتے ہیں دلائل و براہین سے، علم اور بصیرت سے، بشرطیکہ سمجھانے کا طریقہ بھی دلنشین اور جاذبِ توجہ ہو۔ اگر آپ فی الواقع کسی نوجوان کے دل سے شکوک اور شبہات کی پھانسیں نکالنا چاہتے ہیں ـــ تو اُسے

سلیم کے نام خطوط

دیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ اس میں کیا انقلاب آتا ہے!

جلد اول آٹھ روپے | جلد دوم پانچ روپے | جلد سوم پانچ روپے

ملنے کا پتہ: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

حقائق و عِبر

پندرہ لاکھ کا اجتماع

عید الاضحیٰ کے دن جتنے اخبار شائع ہوئے ان میں سے کم و بیش ہر ایک میں، یہ خبر جلی سرخیوں کیساتھ درج تھی کہ

اس مرتبہ حج کے لئے پندرہ لاکھ کا اجتماع ہوا اور انہوں نے نہایت خشوع و خضوع سے
بحضور رب العزت دعا مانگی کہ بیت المقدس پھر سے مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے۔

آپ غور کیجئے کہ دنیا کے مختلف ممالک سے پندرہ لاکھ مسلمان حریم کعبہ میں جمع ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک متفق علیہ مقصد ہے۔ یعنی بیت المقدس کی بازیابی۔۔۔ اور اس کے لئے یہ جمِ غفیر اور گروہ کثیر کرتا کیا ہے؟ خدا کے حضور گڑگڑا کر دعائیں کرتا ہے اور اس کے بعد نہایت اطمینان سے اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتا ہے۔ خدا سوچئے کہ اگر یہ پندرہ لاکھ برہنہ سر، کفن بدوش قلندر حریم کعبہ میں، رب کعبہ کے سامنے اپنے اس عزم کا اظہار کرتے اور پھر اپنے اپنے گھروں کو واپس آجانے کے بجائے اپنی جانیں دے دینے کے لئے سیدھے بیت المقدس کا رُخ کر لیتے، تو ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے، بیت المقدس خالی ہو چکا ہوتا۔

جس کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر ان پندرہ لاکھ حاجیوں نے یہ دعا مانگی تھی، اس کعبہ کی تولیت کی مقدس آرزو خود حضور نبی اکرمؐ کے قلب مبارک میں بھی بیدار ہوئی تھی۔ اور اس کی شدت کی کیفیت یہ تھی کہ خود اس دعا کے سننے والے خدا نے اس کی شہادت ان الفاظ میں دی تھی کہ۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (۲/۱۴۴) ۔۔۔ ہم دیکھتے تھے کہ تیری آنکھیں کس طرح رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں، یہ کہنے کیلئے کہ کعبہ تمہاری تولیت میں آجائے۔ آپ غور کیجئے کہ دعا کرنے والی ہستی خود ذاتِ رسالتمآبؐ، دعا سننے والے کی شہادت کہ ہم تیری شدتِ آرزو کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد اس کعبہ کی تولیت کیسے حاصل ہوئی تھی؟ محض دعا مانگ لینے سے؟ اس کے لئے اس دعا مانگنے والوں کو سات سال تک مسلسل لڑائیاں لڑنی پڑیں، تب جا کر ان کی دعائیں قبول ہوئیں! وہ پندرہ لاکھ نہیں (شاید) پندرہ ہزار بھی نہ ہونگے۔ اور انہوں نے ایک بیت المقدس ہی نہیں، چالیس ہزار شہروں اور قلعوں کو فتح کر لیا تھا۔ یہ تھے اُس زمانے کے 'حاجی'۔ اور اب یہ ہیں ہم اِس زمانے کے حاجی! اس کی وجہ؟ بالکل واضح کہ

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے

نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ اس وقت "رسمِ اذاں" باقی رہ جاتی ہے۔ "روحِ بلالی" باقی نہیں رہتی۔

۲۔ نوائے وقت کی خدمت میں

مؤقر جریدہ نوائے وقت کی ۸ مارچ ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں، محترم مرغوب صدیقی صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ــــ پاکستان نظریاتی طور پر مستحکم کیوں نہیں ہو سکا ــــ انہوں نے اس کی بنیادی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور قائداعظمؒ کو ہدفِ طعن و تشنیع بنایا تھا، انہیں پاکستان میں ممتاز مقام دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے یونینسٹوں کا خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

> یونینسٹوں کے "دریائے کرم" سے فیضیاب ہونے والا ایک نام نہاد عالم فاضل شخص تو یہاں تک کہتے سنا گیا کہ "جس شخص کو تم ایک عظیم مدبر، سیاستدان اور صاحبِ بصیرت مانتے ہو (یعنی قائداعظمؒ) اس کی عقل و فہم کا یہ عالم تھا کہ اس نے چھ کروڑ مسلمانوں کو بچانے کے لئے چار کروڑ مسلمانوں کو (یعنی وہ مسلمان جو بھارت میں رہ گئے) جہنم میں دھکیل دیا۔

محترم صدیقی صاحب کا یہ تجزیہ بالکل صحیح ہے اور ہم ان کی اس رائے سے بھی متفق ہیں کہ جب تک ایسے لوگوں کی سرکوبی نہیں کی جائے گی، مملکتِ پاکستان کبھی مستحکم نہیں ہو سکے گی۔ لیکن اس ضمن میں ہم "یونینسٹوں کے دریائے کرم سے فیضیاب ہونے والے عالم فاضل" کے علاوہ ایک اور عالم فاضل کا نام پیش کرنے کی بھی جرأت کرتے ہیں جس نے اسی نقطہ کو سامنے لاتے ہوئے، قائداعظم کے خلاف وہ کچھ کہا تھا جسے سنکر آج بھی ہر بہی خواہِ پاکستان کا خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ اس نے تحریکِ پاکستان اور تقسیمِ ہند پر بحث کرتے ہوئے، قائداعظمؒ کے متعلق لکھا:

> اس نے حصولِ پاکستان کی جنگ میں ان علاقوں کے مسلمانوں کو شریک کیا جنہوں نے لامحالہ ہندوستان میں رہنا تھا۔ آج یہ اسی کا خمیازہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ان غریبوں کے لئے جہنم بن گئی۔

اس کے بعد اس نے لکھا (کہ تقسیمِ ملک کی وجہ سے)

> پانچ کروڑ مسلمانوں نے انتہائی بے بسی کی حالت میں ایک مفتوح اور شکست خوردہ قوم

کی حیثیت سے اپنے آپ کو اچانک ان ہندوؤں اور سکھوں کے چنگل میں پایا جن کے ساتھ وہ چند روز پہلے دو بدو لڑ رہے تھے۔ اس طرح جو تحریک پوری قوم کو بچانے کے لئے اٹھی تھی اسکی تدبیر مدافعت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نصف کو بچانے کے لئے دوسرے نصف کو ایسی سخت تباہی کے گڑھے میں پھینک دیا گیا جس کا تصور بھی پہلے نہ کیا جا سکتا تھا۔

اس "تباہی" کے بدلے میں قائد اعظمؒ نے جو کچھ حاصل کیا اس کے متعلق ارشاد ہوا:۔

اس سارے اعمالنامہ میں اگر کسی چیز کو نفع کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے' وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہوں نے کم از کم آدھے مسلمانوں کو تو بچا لیا اور ان کی ایک قلمی ریاست بنوادی۔ لیکن افسوس کہ اس "روشن" کارنامے کو بھی ہم بدترین غلطیوں سے داغدار پاتے ہیں اور بری طرح انکا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تقسیم ہند کا معاملہ جس طریقے سے طے کیا گیا وہ غلطیوں بلکہ حماقتوں کا ایک مجموعہ تھا۔

اور پھر اس سارے محاکمے کے بعد لکھا:۔

یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہمارے ملک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی .... یہ ساری جماعت بازی گروں سے ہی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلا بازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشہ دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

نوائے وقت' حریت قلم اور آزادی تنقید کا مدعی ہے۔ کیا ہم توقع کریں کہ جس طرح اس نے' تقسیم ہند کے معاملہ میں' قائد اعظمؒ کی شان میں گستاخی کرنے والے یونیفسٹوں کے دریائے کرم سے فیض یاب عالم فاضل کو مجرم قرار دیا ہے' اسی طرح وہ اس عالم فاضل کو بھی مستحق دار ٹھہرائے گا جس نے' اس سے کہیں زیادہ درشت اور نازیبا الفاظ میں قائد اعظمؒ اور ان کی پالیسی کی مخالفت کی ہے؟ محترم مرغوب صدیقی صاحب نے اس عالم فاضل کا نام نہیں بتایا لیکن ہم اس عالم فاضل کے نام کو پردۂ اخفا میں نہیں رکھنا چاہتے تاکہ نوائے وقت کو ان کے پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ یہ صاحب ہیں امیر جماعت اسلامی' سید ابوالاعلیٰ مودودی' جنہوں نے اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن کی جون، جولائی اور اگست ۱۹۴۸ء کے اشارات (اداریہ) میں وہ کچھ تحریر فرمایا تھا جس کے اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں۔

ملک کا سنجیدہ طبقہ' نوائے وقت کے ردعمل کا منتظر رہے گا۔

---(۱۸۷)---

ایک چشمۂ فیض بند ہو گیا

اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

نم بہ چشم منعماں کم دیدہ ام

لیکن بعض مستثنیات ایسی ہوتی ہیں جو اس قسم کے مسلمات کی تردید کر دیتی ہیں۔ حاجی خیر محمد پراچہ کی زندگی اسی قسم کی مستثنیات میں سے تھی۔ وہ بہت بڑے منعم تھے لیکن ان کی آنکھیں دکھیا انسانوں کے درد و غم کے احساس سے ہمیشہ اشک بار رہتی تھیں۔ وہ مکھڈ کے رہنے والے تھے لیکن ان کا تجارتی کاروبار دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ جو کچھ کماتے اس میں سے غریبوں اور محتاجوں کا حصہ الگ نکال کر رکھ لیتے۔ اور (ہماری معلومات کے مطابق) اس سے غریبوں۔ محتاجوں۔ ناداروں اور مستحق اداروں کی التزاماً امداد کرتے رہتے۔ قرآن مجید سے انہیں دلی لگاؤ تھا اور اس کی تعلیم کے عام کرنے کے لئے مختلف تدابیر سوچتے اور انہیں عمل میں لانے کے لئے سبقت کرتے تھے۔ طلوع اسلام سے ان کا تعارف اسی سلسلہ میں ہوا۔ اور اس کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں انہوں نے ہمیشہ کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے حصہ لیا۔

معلوم ہوا ہے کہ وہ عید الاضحیٰ کی تقریب منانے کے لئے مکھڈ تشریف لے گئے۔ اور عید کے دن، صبح کی نماز کے لئے مسجد میں گئے اور وہیں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ ان کی اس طرح اچانک وفات کی خبر سے ہمیں بے حد صدمہ ہوا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور انکے جانشینوں کو ان کے نقوشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ ہم اس صدمہ میں مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ شریکِ غم ہیں۔

ادارۂ طلوعِ اسلام

تصوّف ـــــ شعبدہ بازوں کی کمند

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ

علامہ اقبالؒ نے جب مثنوی اسرار و رموز شائع کی تو ارباب تصوف کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور انہوں نے ملک میں بڑا ہنگامہ برپا کر دیا۔ حضرت علامہ نے ان کے سنجیدہ اعتراضات کا جواب نہایت وضاحت اور جامعیت سے دیا۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک انگریزی مضمون بعنوان (ISLAM AND - MYSTICISM) لکھنؤ کے اخبار (NEW ERA) کی ۲۸ جولائی ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یہ مضمون اقبال اکادمی (کراچی) کے مجلہ اقبال ریویو کی جنوری ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں، ایک دوسرے مضمون کے ضمن میں اقتباساً درج ہوا ہے۔ اسے ہم اقبال ریویو کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"آج کل کا مسلمان یونانی و ایرانی تصوف کی ان تاریک وادیوں میں بے مقصد و مدعا ٹامک ٹوئیے مارتے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ گرد و پیش کے حقائق ثابتہ سے آنکھیں بند کر لی جائیں، اور توجہ اس نیلی، پیلی اور سرخ روشنی پر جما دی جائے جسے "اشراق" کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت دماغ کے ان خانوں سے پھوٹ کر نکلتی ہے جو ریاضت کی کثرت و تواتر کے باعث ماؤف ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خود ساختہ تصوف اور یہ "فنائیت" یعنی حقیقت کو ایسے مقام پر تلاش کرنا جہاں اس کا وجود ہی نہ ہو، دراصل ایک بدیہی علامت ہے جس سے عالم اسلام کے روبہ انحطاط ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

دنیائے قدیم کی تاریخ ذہنی کے مطالعے سے یہ نہایت اہم حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ زوال پذیر قوموں اور گروہوں نے ہر دور میں اس خود ساختہ تصوف اور فنائیت کے اوٹ میں پناہ لی ہے۔

جب روحِ حیات فنا ہوجاتی ہے اور زمان و مکان کے مسائل سے دست و گریباں ہونے کی ہمت باقی نہیں رہتی تو داعیانِ انحطاط ایک مزعومہ ولایت و سرمدیت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح اپنے معاشرے کی روحانی بے مائیگی اور جسمانی فرسودگی کو آخری مرحلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ بظاہر ایک لبھا لینے والا نصب العین وضع کر لیتے ہیں جس کے فریب میں مبتلا ہو کر صحت مند اور قوی افراد بھی رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کا نظام ایک خاص نوعیت کا ہے جسے اوہام و وساوس کے ان ماتوں نے شدید نقصان پہنچایا ہے۔ بحیثیت ایک معاشرے کے، ہماری تخلیق اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اجتماعی ترتیب و تنظیم میں نسل و زبان کے امتیازات پر خطِ نسخ کھینچ دیا جاتا ہے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس نظامِ شریعت کے تابع رکھیں جو اصلاً الہامی مانا جاتا ہے۔ لیکن قدیم صوفیہ کا عقیدہ یہ تھا کہ شریعت کی حیثیت تو محض ایک مظہر کی تھی۔ اور وہ خفیہ خفیہ اس کی تلقین بھی کرتے رہے۔ یعنی کہتے رہے کہ یہ حقیقت کا ایک قشر اور ایک پردہ ہے۔ اور حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ شریعت سے الگ ہے۔ اکثر حالتوں میں شریعت کی پابندی قائم رکھی گئی تھی کہ اجتماعی تفرقہ سے بچے رہیں، اگرچہ اس کی حیثیت ایک پردے ہی کی رہی۔ اسلامی فکر و ادب کا مطالعہ کرنے والا کوئی فرد اس اعتراف میں متأمل نہ ہوگا کہ شریعت سے اعراض کا رجحان اسی جھوٹے تصوف کا براہِ راست نتیجہ ہے جو عجمی دل و دماغ کی پیداوار ہے، حالانکہ شریعت ہی اسلامی معاشرے کو منظم و مرتبط رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

یوں اسلامی جمہوریت رفتہ رفتہ اپنے اصل مقام سے ہٹتی گئی اور اسے ایک نوع کی روحانی امرائیت (آمریت ؟) کا غلام بنا دیا گیا۔ یہ امرائیت (آمریت ؟) ایسے علم و قوت کی مدعی تھی جس کے دروازے عام مسلمانوں پر بند تھے .... مسلمانانِ اندلس ارسطاطالیسی روحیت سے آگاہی کے باعث مغربی اور وسطی ایشیا کے ضعف انگیز اثرات فکر کے دائرے سے باہر تھے۔ وہ ایشیائی مسلم قوموں کے مقابلے میں روحِ اسلام سے قریب تر تھے۔ آخر الذکر قوموں نے عربی اسلام کو عجمی تخیلات میں ڈھلنے دیا، یہاں تک کہ وہ اپنی حقیقی و اصلی حیثیت سے بالکل محروم ہوگیا۔ تسخیرِ ایران کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا، بلکہ یہ نکلا کہ اسلام ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔

مغربی اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ دسویں صدی عیسوی کے بعد سے کیجیے، جو کچھ میں اوپر لکھ چکا ہوں، اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق و توثیق ملے گی: انحطاط کے سحر کی کیفیت یہی ہے کہ جن ہاتھوں سے ہم زہر کا پیالہ پیتے ہیں، انہی کو چومتے ہیں۔

واضح رہے کہ اسلام کا آفتاب تاریخ کے روزِ روشن میں افق پر جلوہ گر ہوا تھا۔ ہمارے جمہوریت پرور پیغمبرِ اعظم

نے عاقل و دانشمند اصحاب پیدا کئے جنہوں نے اسلام میں زندگی بسر کی اور انہی میں کام کرتے رہے۔ ان اصحاب نے ایک ایک لفظ آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا جو اس پیغمبرِ اعظمؐ کی مقدس و بابرکت زبان پر جاری ہوا۔ حضورؐ کی تعلیمات میں کوئی بھی چیز نہیں جسے مخفی کہا جا سکے۔ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ زندگی کی مسرت اور روشنی سے لبریز ہے۔ یہ تاریک اور قنوطیت افزا تصوف کے لئے وجہ جواز مہیا کرنے ہی سے پاک و مبرا نہیں بلکہ ان تمام مذہبی تعلیمات کے خلاف کھلا ہوا جارحانہ اقدام ہے جنہوں نے صدیوں تک عالمِ انسانیت کو مبتلائے فریب رکھا۔

پھر آیئے! دنیا کے حقائق کو خوشی خوشی قبول کیجئے۔ خدا اور اس کے رسولِ پاک صلے اللہ علیہ وسلم کے جلال و عظمت کی خاطر ان حقائق سے عہدہ برآ ہونے کی سعی و کوشش میں مصروف ہو جائیے۔ اس شخص کی بات پر کان نہ دھریئے جو کہتا ہے کہ اسلام میں کوئی مخفی اصول بھی ہے جسے محض ناشناساؤں پر منکشف نہیں کیا جا سکتا۔ اسی پر جھوٹے مدعیوں کے اقتدار اور آپ کی غلامی کا انحصار ہے۔

دیکھئے کس طرح رومی مسیحیت کی روح نے اپنے گرد و پیش مستحکم حصار تعمیر کر لئے تاکہ اس کی تاریک سلطنت تاریخ نگاروں کے ممکن حملوں سے محفوظ رہے۔ ایسے ہی لوگوں نے تاریخِ اسلام سے آپ کی ناواقفیت کی بنا پر فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو غلام بنا رکھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ تاریخ کی روشنی کبھی نہ کبھی ان کی تعلیمات کے دھندلکے کو آپ کی ذہنی فضا سے زائل کر دے گی۔ لہٰذا وہ آپ کو سکھاتے ہیں کہ حسی ادراک، حجابِ اکبر ہے (العلم حجاب الاکبر)۔ حسی ادراک کے یہ دشمن آپ کے احساسِ حقائق کو کند کرتے ہیں اور علمِ تاریخ کی بنیادیں کھوکھلی کر دیتے ہیں۔

نوجوان مسلمانو! اس شعبدہ بازی سے خبردار رہو۔ شعبدہ بازوں کی کمند بڑی مدت سے تمہاری گردنوں پر پڑی ہوئی ہے۔ دنیائے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے غیر مصلحانہ انداز کی اس توحید کو اپنا لیا جائے جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ عجمیت کے دھندلکے سے باہر نکلو اور عرب کے درخشاں صحرا کی روشن فضا میں آ جاؤ۔"

استدراک

حامیانِ تصوف کی طرف سے اس قسم کے اعتراضات کے سلسلہ میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اعتراضات "عجمی تصوف" کے خلاف پڑتے ہیں، "اسلامی تصوف" کے خلاف نہیں۔ تصوف کی اس قسم کی تفریق خود فریبی یا جہالت پر مبنی ہے۔ تصوف کی (INSTITUTION) ہی غیر اسلامی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، "تصوف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے"۔ جو چیز اپنی اصل و بنیاد کی رو سے سرزمینِ اسلام

میں اجنبی پودے کی حیثیت رکھتی ہے اس کی "اسلامی اور غیر اسلامی" تفریق غلط ہے۔ جب تصوف کا وجود ہی غیر اسلامی ہے تو "اسلامی تصوف" کون سا ہو سکتا ہے؟ اسلام وہ ہے جسے خدا نے اپنی کتاب میں مکمل اور غیر متبدل طور پر دے دیا۔ اور جس پر عمل کر کے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دکھا دیا۔ قرآن میں تصوف کا لفظ تک نہیں آیا۔ اسلام ایک نظامِ زندگی ہے جس میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کے ماحصل کو قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے صرف کیا جاتا ہے۔ جو تصور یا ادارہ (انسٹی ٹیوٹ) دین کی اس اصل و بنیاد کے خلاف جائیگا، وہ اسلام کے خلاف ہوگا، لہٰذا عجمی اور عربی یا اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کی تمیز و تفریق حقیقت سے اغماض اور کتمان ہے۔

(طلوعِ اسلام)

بقیّہ نقد و نظر صفحہ (۴۶) سے آگے

وحیا اسلامی نظام کی عدم موجودگی ہے۔ اس نظام کی موجودگی میں شریعت سے متعلق تمام امور کا فیصلہ مرکز ملت کی طرف سے ہوتا ہے جس سے کسی کو مجالِ سرتابی نہیں ہو سکتی۔ مرکز ملت کی موجودگی میں مذہبی پیشواؤں کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ مرکز کی عدم موجودگی میں امت کی حالت کیا ہو جاتی ہے اس کا منظر ہماری مساجد میں نظر آ جائے گا۔ مسجد میں جب ایک امام کے پیچھے نماز (باجماعت) ادا کی جاتی ہے تو مقتدی لاکھوں کی تعداد میں بھی کیوں نہ ہوں سب ایک آواز پر جھکتے اور ایک آواز پر اٹھتے ہیں۔ ان سب میں کامل ہم آہنگی ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر امام سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا سجدہ سہو بھی تمام نمازیوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن فرضوں کی نماز کے بعد جب نمازی سنتیں پڑھنے لگتے ہیں تو وہی مسجد ہوتی ہے، وہی نمازی اور وہی نماز۔ لیکن اب صحنِ مسجد عجیب قسم کی نفسانفسی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ کوئی کھڑا ہے کوئی بیٹھا۔ کوئی رکوع میں ہے کوئی سجدے میں۔ کوئی جوتا پکڑے باہر جا رہا ہے، کوئی اسے روک رہا ہے کہ نمازیوں کی نماز خراب نہ کرو۔ غرضیکہ وہاں عجیب انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حالت "بے امام امت" کی ہو جاتی ہے۔

سو صفحات کا یہ کتابچہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور سے مل سکتا ہے۔ اس پر قیمت ۱/۵۰ پیسے درج ہے جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ کیونکہ چھوٹے سائز کے نیوز پرنٹ پر چھپے ہوئے اتنے سے پمفلٹ کی اتنی زیادہ قیمت نہیں ہونی چاہیئے۔

خورشید عالم

سمندر کا عالمی کردار

سمندر! اسرار و رموز کا خزینہ! کھنگی پہ جائیے تو کیڑے ہی کیڑے دکھائی دیں، اور نازکی کو لیجئے تو شبنم، بارش اور دنیا بھر کے دریا ہر آن اس کا منہ دھوتے نظر آئیں۔ زمینی زندگی سے قدیم تر اور زندگی کا گہوارۂ اولین۔ زندگی کی غیر مرئی اور غیر محسوس لرزش نے پہلے پہل اپنے لئے سمندر ہی کا پہلو منتخب کیا۔ سمندر ہی کے بطن سے وہ جرثومۂ حیات ابھرا جو نوع در نوع، پیچ در پیچ، تنگناؤں سے گزرتا انسانیت کی جلوہ گاہِ رنگ و بو تک پہنچا۔ سمندر زندگی کا مرقد! کیا کیا کچھ اس میں ڈوب ڈوب نہیں گیا — ایسے کہ پھر سے ابھرا بھی تو چہرے دگرگوں کئے۔ سمندر روئیدگی اور زندگی کا ذریعہ! اس کے سفیرِ حیات ہوا کے دوش پر سوار اطراف و اکناف میں خوشوں خوشوں کی جبین موتیوں سے بھرتے ہیں اور زندگی کو رنگ و نم اور لہو سے مالامال کئے رکھتے ہیں۔ سمندر نے اپنے اندر پہاڑ سمیٹے، طوفان سینے میں سموئے — اور رواں دواں، جواں، ہیجان و اضطراب کی وہ کیفیت پیدا کی جس نے انسان پر اسرارِ حیات کھولے۔ انسان اس کے ساحل تک پہنچا تو خار و خس و خاشاک کی سوغات اسے بہم آرائی پر مجبور نہ کر سکی۔ گوہرِ زندگی کی تلاش میں وہ سمندر میں اتر گیا۔ اس نے حیاتِ جاوداں کا راز اس ستیز میں پایا جو بہیا غلط و با موجش درآویزہ سے پیدا ہوئی۔ پھر سمندر انسان کے لئے ایک اور زمین بن گیا اور اس زمین پر اس نے نئے راستے تراشے اور ان پر چلنے کے لئے نئی سواریاں ترتیب دیں۔

سمندر نے وہ انسان بھی دیکھا جو گھوڑے پر سوار اس کے کنارے آیا۔ وہ نہ رکا نہ جھکا، پانی میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور گھوڑا ڈوبنے لگا تو بے ساختہ پکار اٹھا — اے میرے اللہ! یہ سمندر راستے میں حائل نہ ہوتا تو میں تیرا نام زمین کے دوسرے کنارے تک پہنچا دیتا — یہ انسان اپنے گھوڑے سمیت لوٹ آیا لیکن اس کی للکار رائیگاں نہیں گئی۔ اس کے رفقاء فوج در فوج، موج در موج، آگے بڑھے۔ وہی جوش تھا، وہی ولولہ تھا، البتہ ان کے پاس گھوڑے نہیں تھے کشتیاں تھیں۔ سمندر کا سینہ چیرتے، طوفانوں سے ٹکراتے، طوفان اٹھاتے،

بڑھتے ہی چلے گئے۔ ان کشتیوں میں سوار سپاہی بھی تھے تاجر بھی۔ ان کے ہاتھوں میں تلوار تھی تو، اور کندھوں پر فروختنی سامان تھا تو، ان کے جلو میں قندیلیں تھیں ــــ تہذیب و انسانیت کی قندیلیں جن سے ایک عالم بقعۂ نور بن گیا۔ زمین اپنے رب کے نور سے جگمگاتی دکھائی دینے لگی تو رات کے شہباز اٹھے۔ ان کے سیاہ، گھناؤنے پھیلے، پھڑپھڑاتے پروں نے گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیلا دیا، اور ایک بے نور اندھی رات کا سماں طاری کر دیا۔ اس میں سورج بھی غروب نہیں ہوتا تھا لیکن یہ لگتا تھا کہ انسانیت کی اس رات کو سحر کرنے کے لئے فطرت ہلکا سا اشارہ کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔

یہ یورپ کا عہد تھا۔ یورپی انسان کا تمام تر انحصار مشینوں پر تھا اور برق و بخارات اس کے کمالات کی حد آخریں تھے۔ مشینوں کے زور پر وہ اپنی زمین سے سمندر کے راستے دوسروں کی زمینوں تک پہنچا۔ اس کا دعوٰے تہذیب کا تھا اور پیشہ قزاقی کا۔ دیکھتے دیکھتے بحر و بر اس کی قزاقی کا تختۂ مشق بن گئے اور ہر طرف فتنہ و فساد پھیل گیا۔ اس نے دریائی قزاقی کو میدانی قزاقی کا ذریعہ بھی بنایا اور بہانہ بھی۔ اقوامِ یورپ میدانی قزاقی میں اس قدر آگے بڑھ گئیں کہ دریائی قزاقی ثانوی حیثیت اختیار کر گئی۔ اگر کوئی نگاہِ غلط انداز اُدھر گئی بھی تو یہ کہہ کے اسے ہٹا دیا گیا کہ بحریہ دفاع اور تجارت کے تقاضے پورے کرنے کا ناگزیر اور مؤثر ذریعہ ہے۔ یہ تأثر دیدہ دلیرانہ تھا کیونکہ دفاع اور تجارت دونوں قزاقی ہی کے بلند بانگ اور دلفریب نام تھے۔ یہ سلسلہ بہر نوع چلتا رہا تاآنکہ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد ایک حد تک اور دوسری عالمگیر جنگ کے بعد بہت حد تک دوسروں کی زمین اقوامِ یورپ کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ استعمارِ یورپ کے لئے یہ بہت بڑی پسپائی تھی۔ توقع بندھ چلی تھی کہ یہ پسپائی مکمل ہو گی اور جلد ہی سفید فام استعماری اقوام اپنے اپنے گھروں کو لوٹ بھی جائیں گی اور ان میں سمٹ کے رہنا قبول بھی کریں گی۔ یہ انسانیت کی فتحِ عظیم کا پیش خیمہ تھا مگر غلامی کے جس طوق کو زمین نے حقارت سے اتار پھینکا تھا، وہ سمندر کے گلے کا ہار بن گیا۔ یوں غلام ممالک تو آزاد ہو گئے لیکن آزاد سمندر غلام بن گئے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد استعمارِ یورپ سمٹ کر امریکہ کے ہاتھوں میں آگیا اور وہی اس کا علمبردار اور مظہر بن گیا۔ اس استعمار کے تقاضے جنگ کے دوران وضع ہونے والے غیر معمولی طور پر دور مار آلاتِ جارحیت نے نمایاں طور پر بدل دیئے تھے۔ امریکہ کا مقابلہ روس سے تھا جو جنگ کے دوران اس کا حلیف تھا اور جنگ کے بعد واحد حریف بن گیا تھا۔ اس حریف کے رازِ درونِ خانہ جاننے کے لئے امریکہ کو اس کے پڑوس میں زمینی اڈوں کی اشد ضرورت تھی۔ مغربی یورپ سے مشرقِ بعید تک امریکہ نے ایسے اڈوں کا ایک جال بن دیا۔ اس سلسلے کو مزید تقویت دینے کے لئے امریکہ نے سمندر سے رجوع کی۔ بحرِ اوقیانوس روسی خطرے سے بہت حد تک محفوظ تھا۔ اس احساسِ حفاظت کی بدولت اس نے اپنی توجہ زیادہ تر شمالی اوقیانوس پر مرکوز کی اور تقریباً سولہ ممالک کی ایک

عسکری تنظیم متشکل کرلی۔ یہ تنظیم بری بھی ہے اور بحری بھی۔ یہ بری اس لئے ہوگئی کہ اس کے شریک تمام کے تمام ممالک روس سے خائف تھے اور خوف کے مشترکہ جذبے کی بنا پر انہوں نے اپنی تنظیم میں شمولیت، نیز اس کے اپنے ہاں اڈے قائم کرنے میں اپنی عافیت سمجھی۔ بعد میں جوں جوں نت نئے آلاتِ جنگ زیادہ سے زیادہ دور مار ہوتے گئے، معاہد ممالک میں زمینی اڈوں کی اہمیت کم ہونے لگی۔ چنانچہ اب جو اڈے باقی رہ گئے ہیں وہ اپنی اہمیت اور افادیت کم و بیش زائل کر چکے ہیں۔ امریکہ ان سے دستبردار ہو بھی رہا ہے اور کیا بھی جا رہا ہے۔

اس سے سمندر کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ بحر اوقیانوس محفوظ تھا اور محفوظ ہے لیکن بحیرہ روم کے لئے روسی خطرہ خارج از امکان نہیں کہا جا سکتا تھا۔ روس کی خارجہ حکمت عملی کا نقطۂ ماسکہ تھا کہ وہ یہاں تک پہنچے۔ گو اس سمندر کے سواحل پر یورپ اور افریقہ میں دونوں طرف امریکہ کے زمینی اڈے موجود ہیں تاہم امریکہ نے اپنا ایک جنگی بیڑہ اس سمندر میں روسی خطرہ کے سدباب کے لئے متعین کر دیا۔ اس طرح نہ صرف بحیرہ روم کی گذرگاہوں میں امریکہ کا اثر و دخل ہو گیا بلکہ ساحلی ممالک میں اس کی مداخلت کا امکان اور خطرہ بڑھ گیا۔ ۱۹۵۸ء میں تو اس نے لبنان میں مداخلت کر بھی دی تھی اور وہاں فوجیں اتار دی تھیں۔ اس نے ایسا کیوں کیا اور اس کا انجام کیا ہوا، یہ علیحدہ موضوعِ گفتگو ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس نے بحیرہ روم میں اپنی موجودگی کا فائدہ اٹھایا اور ایک غیر ملک کے امور میں فوجی مداخلت کی۔ امریکہ اس کا جواز کچھ پیش کرے، اس کا یہ اقدام صریح جارحیت ہے۔ ایسی جارحیت کا خطرہ اس وقت تک رہے گا جب تک جنگی بیڑے کھلے سمندروں میں بے دریغ پھرتے رہیں گے۔ گویا سمندر کو غلام بنا لینے سے اس کے کنارے کے تمام ممالک کے لئے جارحیت کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے سمندر کے عالمی کردار کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ کردار دن بدن ابھر رہا ہے۔ بحیرہ روم سے آگے یعنی نہر سویز سے لے کر آسٹریلیا بلکہ نیوزی لینڈ تک امریکہ کو ایک عرصہ تک چنداں فکر دامن گیر نہ ہوئی۔ اس سارے علاقے میں برطانیہ کا اثر و اقتدار کسی نہ کسی رنگ میں مضمر تھا۔ کہیں اس کے معروف علاقے تھے اور کہیں جنگی اڈے تھے۔ فوجی نقطۂ نگاہ سے دونوں صورتوں کا نتیجہ یکساں تھا۔ اور امریکہ کو اس سے بجا طور پر اطمینان تھا۔ دوسری جنگ کے بعد برطانیہ اپنی مصلحت کے تحت امریکہ کو ان علاقوں میں لانے اور دخیل کرنے میں لگ گیا تھا۔ آسٹریلیا سے آگے بحرالکاہل آجاتا ہے جو بہت حد تک امریکہ کے رحم و کرم پر ہے۔ فلپائن، فارموسا اور جاپان امریکہ کے بہت بڑے بحری مراکز ہیں۔ ان سے آگے امریکہ کے اپنے سواحل تک بے شمار جزیرے ہیں جو فوجی اڈوں کے طور پر اور جنگی مقاصد ہی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ دنیا کا نقشہ دیکھا جائے تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک قدم قدم پر بری اور بحری جنگی اڈے نظر آئیں گے۔ جہاں اڈے نہیں ہوں گے وہاں بحری بیڑے گشت کر رہے ہوں گے اور انہوں نے

دور و نزدیک ایسے مقامات متعین کر رکھے ہوں گے جہاں سے آگ اور اسلحہ کا ایندھن ان کے پیٹ میں بھرا جاتا ہے۔ یہ اڈے امریکہ کی شوخیِ استعمار کے نقوش ہیں اور ایسے راستوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن پر کوئی چل کے گیا نہیں بلکہ چلتا چلا جا رہا ہے۔

جیسا کہ ان صفحات میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے، دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمی توازنِ قوی میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ سب سے نمایاں تبدیلی ایٹمی قوت کی دریافت بلکہ اس کا سنگدلانہ اور جارحانہ استعمال اور اس خوفناک حد تک تباہ کار قوت پر امریکہ کا اجارہ دارانہ قبضہ تھا۔ اس کے زور پر فتح حاصل کر لینے کے بعد امریکہ کے دماغ میں جس قدر بھی شیطانی وسوسے پیدا ہوتے کم تھے۔ اسے ساری دنیا اپنے قدموں میں دکھائی دی لیکن قبل اس کے کہ یہ وساوس بروئے کار آتے، تدبیرِ استعمار کے شاطر کو تقدیر نے مات دینے کے سامان پیدا کر دیئے۔ جیبوں میں ڈالر بھرے اور بغل میں ایٹم بم دبائے جاپان کا فاتح امریکہ چین کی ابھرتی انقلابی قیادت کے روبرو آ گیا اور منہ کی کھا کے نکلا۔ یہاں سے وہ دوسری بنیادی تبدیلی سامنے آتی ہے جس نے جنگِ عظیم دوم کے بعد عالمی توازنِ قوی کو متاثر کیا۔ یہ تبدیلی سیاسی آزادی کی رو تھی جو ایشیائی اور افریقی ممالک میں اٹھ اٹھ کر استعمارِ فرنگ کو پسپا کرنے کا موجب بن گئی۔ اقوامِ یورپ نے مقبوضہ ممالک سے بے دخل ہوتے اتنا انتظام ضرور کر لیا کہ جگہ جگہ ان کے فوجی اڈے بھی قائم رہیں اور معاشی معاونت کے پردے میں وہ نو آزاد ممالک پر اپنا اثر بھی برقرار رکھ سکیں۔ تاہم آہستہ آہستہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ آزاد ممالک میں فوجی مراکز زیادہ دیر تک برقرار رکھنا آسان نہیں۔ جن ممالک نے وقتی مجبوری یا مصلحت کے تحت ایسی ذلت گوارا کر لی تھی ان کی قومی غیرت بہت جلد جوش میں آ گئی جس سے جارحانہ مراکز یا تو ختم کر دینے پڑے، یا وہ عملاً بے کار ہو کے رہ گئے۔ ان کے آئینی اور اخلاقی جواز کا بہرحال کسی قسم کا سوال نہ رہا۔

ذہنِ استعمار نے اس بدلتی صورتِ حال سے یوں مطابقت کی کہ اس نے بری اڈوں کو بتدریج خیرباد کہنا شروع کر دیا۔ البتہ جہاں جہاں وہ طوعاً و کرہاً مزید تھوڑی بھی دیر کے لئے برقرار رہ سکتے تھے ان کے رکھنے میں پوری ڈھٹائی سے کام لینے لگا۔ یوں سمندر استعماری قبضے میں آنے لگے۔ بحیرہ روم میں امریکہ کا آٹھواں بحری بیڑہ بہت پہلے سے متعین تھا۔ ۱۹۵۰ء میں اس کا چھٹا بیڑہ جنوبی چینی سمندر میں یعنی انڈونیشیا کے شمال میں، چین کے جنوب میں، فلپائن کے مغرب میں اور ویٹ نام کے مشرق میں آ موجود ہوا۔ جو بیڑے انڈونیشیا تک کا سمندری علاقہ امریکہ کی براہ راست دستبرد سے محفوظ چلا آ رہا تھا۔ گو استعمار کے کانٹے اس آبی کھیت میں جگہ جگہ بوئے ہوئے تھے۔ اس کا مزارعہ برطانیہ تھا جو نہر سویز کے مشرق میں کلبہ رانی کرنے کے لئے آزاد تھا۔ امریکہ نے ایک عرصہ برطانیہ پر تکیہ کئے رکھا لیکن اسے بالآخر یہ اندازہ ہو گیا کہ برطانوی استعمار

کی لاٹھی کرم خوردہ ہو چکی ہے اور وہ سفید سامراج جارحیت کا بوجھ تا دیر نہیں سنبھال سکے گی۔ یہ وہ وقت تھا کہ جارحیت کے چشمے بہت اونچے ابلنے پر آ گئے تھے۔ امریکہ کی شہ پر بھارت کے لشکر دنیا کی چھت پر چڑھ جانے کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگے۔ لب بام پہنچنا تو بڑی بات ہے، زینہ استعمار پر اس لشکر نے قدم رکھا ہی تھا کہ چین نے زینہ الٹا کے رکھ دیا۔ اپنی نامرادی کے یقینی آثار دیکھ کر امریکہ برصغیر کے جنوب میں اپنا ساتواں بیڑا لے کے پہنچ گیا۔ خطرہ تھا تو دور شمال میں، اور وہ بھی دنیا کے بلند ترین سلسلہ ہائے کوہ کے اس پار لیکن اس کے سدباب کے لئے امریکہ نیچے جنوب میں سمندر پر مسلط ہو گیا۔ اس بیڑے کی آمد جارح امریکہ اور طفیلی بھارت دونوں کے عزائم مشئومہ کی مظہر تھی۔ پنڈت نہرو جیسے غیر جانبداری کے دعوے دار نے اس آمد کو بجا طور پر "باعث آبادیٔ ما" سمجھا، اور اس کا عیارانہ خیر مقدم کیا۔ ایشیا اور افریقہ کی اقوام بالعموم اس خطرے کی سنگینی کو بھانپنے سے قاصر رہ گئیں۔ برہمن بھارت سمندر پار سے اپنے لئے کشتیٔ بلا لایا تھا اور کوئی یہ سمجھنے پر تیار نہ ہوا کہ یہ کتنی بڑی جارحیت کا پیش خیمہ ہے۔ کسی کے ذہن میں یہ بات آ بھی گئی تو ایسی کوئی تدبیر سامنے نہیں آئی جسے پیش بندی کی دلیل سمجھا جاتا۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ منافقانہ غیر جانبداری کا خناس بہت سے ملکوں میں ایسا سمایا ہوا تھا کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔

جس فتنے کا بیج بویا گیا تھا وہ برگ و بار لانے لگا ہے۔ صحیح تر الفاظ میں اسے برگ و بار لانے دیا جا رہا ہے۔ امریکہ نے یہ بیج بویا۔ بھارت نے اسے اپنی کشت آزادی کے لئے قبول کیا۔ اور ایشیا اور افریقہ کی قومیں اس بوائی کا تماشا دیکھتی رہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ استعماری قوتوں کا ہجوم اس سمندر میں ہو رہا ہے جس سے یہ قومیں براہ راست متاثر ہوتی ہیں۔ پھر نقشہ سامنے لائیے اور دیکھئے کہ کسی اور سمندر میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی۔ بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل میں امریکہ کا جیسا تسلط تھا ویسا اب بھی ہے۔ صرف بحیرہ روم میں پچھلے سال سے روسی بیڑہ آ موجود ہوا ہے اور بحیرہ قلزم اور خلیج عقبہ کا راستہ جارحیت کے زور سے کھلا نہیں اور بند ہو گیا ہے۔ اس نئی صورت حال سے امریکہ کی حیثیت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ فرق آیا ہے تو نہر سویز کے مشرق میں آیا ہے جہاں سے انگریز جونک کی طرح چپکے رہنے کے باوجود بے دخل ہونے پر مجبور ہو گیا ہے اور اس نے جبر و اکراہ سے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے آخر تک وہ جملہ بری اور بحری مراکز کو خالی کر دے گا۔ یہ اعلان مظہر ہے اس حقیقت کی بے پناہی کا کہ برطانیہ ان علاقوں پر بالادستی برقرار رکھنے پر قادر نہیں رہا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ استعمار کی دُم سیدھی ہو گئی ہے۔ یہ دُم نہ سیدھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی۔ اسے بالآخر کاٹ پھینکنا ہو گا لیکن جس تیزی سے اہتمام بھی اسی کا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ہر عنت سے بدلتا مزاج روزگار یہی پتہ دے رہا ہے۔

اس اعلان سے پہلے برطانیہ نے امریکہ کا راستہ صاف کرنے میں استعماری جاروب کشی کا پورا مظاہرہ

کیا۔ اس نے اپنے اقتدار کا فائدہ اٹھا کر کئی جزیرے تاکے جو یا تو غیر آباد تھے یا ان میں برائے نام آبادی تھی۔ کسی کو اس نے مواصلاتی مرکز کا نام دیا اور کسی کو ایندھن کا ذخیرہ کہا۔ دونوں طرح کے جزیروں کو اس نے عملاً امریکہ کی تحویل میں دے دیا۔ اس سے امریکہ کے ساتویں بیڑے کے قدم زیادہ مضبوط ہو گئے۔ کہیں زیادہ اس لئے کہ یہ امکان ختم کر دیا گیا کہ آئندہ کوئی مقامی آبادی ان جنگی مراکز کی مخالفت کر سکے۔ یہ تیسرا پینترا ہے جو استعمارِ فرنگ نے بدلا ہے۔ صدیوں اقوامِ مغرب نے ممالکِ مشرق پر قبضہ کئے رکھا اور انہیں بے دریغ لوٹتی رہیں۔ اس غصب و سلب و نہب کے خاتمے کی طرح سیاسی آزادی سے پڑنے لگی تو امریکہ نے ویت نام کا تجربہ کیا یعنی اُس نے اس ملک پر رسمی قبضہ نہیں کیا، جیسا کہ اس سے پہلے فرانس کا تھا، بلکہ زبردستی جنوبی ویت نام کا حلیف بن بیٹھا۔ اور یہ سمجھنے اور سمجھانے لگا کہ ایک آزاد حکومت کی دعوت پر اس کی مدد کے لئے وہ پہنچا ہے، اور صرف اپنا حقِ دوستی پورا کر رہا ہے۔ اس لاطائل دلیل کی قلعی حالات کی رفتار نے کھول کے رکھ دی ہے اور خود امریکہ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ دوست تو کیا وہ خوانده مہمان بھی نہیں، نہ تھا نہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ انسانی آبادیوں سے دور بھاگ رہا ہے۔ اور ایک طرف کھلے سمندروں میں جنگی بیڑوں کے جال پھیلا رہا ہے اور دوسری طرف اسے اپنے استعمار بے پردا کی بے نقابی کے لئے "شہروں" کے مقابلے میں ویران جزیروں کے "بن باسے" ہو گئے ہیں۔ استعمار کے اس تیسرے پینترے میں پہلے دو پینتروں کی آمیزش نے اس مسئلے کو بڑا سنگین اور افریشیائی برادری کے لئے گہری فوری توجہ کا مرکز بنا دیا ہے۔

حالات کی بے پناہی کے سامنے سپر ڈالنے اور پسپا ہو جانے سے پہلے پہلے برطانیہ نے بندوبست کر لیا ہے کہ امریکہ کے قدم مضبوطی سے جم جائیں اور ساتویں بیڑے کی تقویت اور امداد کے لئے نو آزاد ماریشیس اور آسٹریلیا کے مقبوضہ جزائر پوری طرح امریکہ کے تصرف میں آجائیں۔ پھر بھی اسے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اس کے جانے سے جو نام نہاد خلاء پیدا ہو گا اسے استعمار کے کسی معتمد طفیلی سے پُر کرانا چاہیئے۔ اس سے برطانیہ (اور امریکہ) کے دل کے اس چور کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اس قدر طاقت کے باوجود اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتے ہیں۔ استعمار کی یہی بنیادی کمزوری ہے کہ وہ لاؤ لشکر کے باوجود دیارِ غیر میں محفوظ و مصئون نہیں ہوتا اور بالآخر شکست کھا جاتا ہے۔ بہرحال، اس خلاء کو عملاً تو امریکہ پُر کر رہا ہے لیکن بھارت کو آگے بڑھایا جا رہا ہے تاکہ اس بہانے امریکہ کی عمر دراز ہو۔ یہ اتفاق نہیں بلکہ بدلے اور بدلتے ہوئے حالات کا نتیجہ ہے کہ بھارت ان دنوں زیادہ سے زیادہ زور بحری قوت پر لگا رہا ہے۔ سمندر میں اسے کسی سے خطرہ نہیں۔ پاکستان کی بحری قوت کا اس سے کچھ مقابلہ ہی نہیں۔ برما، ملیشیا، انڈونیشیا وغیرہ ممالک سے بھی اسے اس قسم کا خطرہ نہیں ہو سکتا۔ افریقہ کے ساحلی ممالک کی نہ بھارت سے دشمنی ہے اور نہ وہ بحری قوت کے اعتبار سے کسی گنتی میں آسکتے ہیں۔

اگر بالفرض بھارت کو کہیں سے خطرہ لاحق بھی ہو تو سمندر میں امریکہ کی موجودگی میں اسے کسی قسم کی فکر نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن وہ دیوانہ وار بحری قوت بڑھانے میں لگا ہوا ہے۔ بحیرہ عرب کے جنوب مشرق میں لکادیپ کے جزیروں میں وہ بحری مستقر بنا رہا ہے۔ ان جزائر کے جنوب میں مالدیپ جزائر ہیں جو سیلون کی تحویل میں تھے لیکن اب آزاد ہو چکے ہیں۔ ان جزائر پر بھارت کی نگاہیں ہیں اور وہ اس فکر میں ہے کہ کسی نہ کسی طور ان پر اپنے قدم جما لے۔ آگے چل کر خلیج بنگال میں نکوبار اور انڈمان کے سلسلہائے جزائر ہیں۔ انہیں تیزی سے بحری مستقر بنایا جا رہا ہے اور امریکہ، برطانیہ اور روس سے بے دریغ مدد لی جا رہی ہے۔ گویا بیرونی دائرہ امریکہ کے تصرف میں ہے تو اندرونی دائرہ بھارت کے قبضے میں ہے۔ یہ دونوں دائرے کہنے کو علیحدہ علیحدہ ہیں ورنہ ہیں ہم مرکز۔ امریکہ کی شہ پر بھارت اپنے قریبی ہمسایوں کے راستے روک رہا ہے۔ دو حصوں میں منقسم ہونے کی وجہ سے پاکستان کی ضرورت یہ ہے کہ بحیرہ عرب اور خلیج بنگال میں اس کی آمد و رفت آزادانہ ہو۔ سیلون کے مفاد کا بھی تقاضا یہی ہے کہ سمندر کے راستے اس کے لئے کھلے رہیں۔ بالکل اسی قسم کا مفاد برما، ملیشیا اور انڈونیشیا کا ہے۔ لیکن بھارت اپنے تحفظ کے پردے میں بحری ناکہ بندی پر اترتا آ رہا ہے۔ وہ اپنے منصوبے کی تکمیل میں کامیاب ہو گیا تو بحیرہ عرب اور خلیج بنگال میں دوسرے ممالک کا گذرنا ممکن نہیں تو بہت دشوار ہو جائے گا۔ اور اس کا فیصلہ بھارت کرے گا کہ کون گئے اور کون نہ گزرے۔ جہاں جنوب میں اور کھلے سمندر کا تعلق ہے وہاں بھارت کے اثر و نفوذ کی حد ختم نہیں ہو گی کہ امریکہ کا اثر و نفوذ شروع ہو جائے گا۔ اور بات امریکہ تک ہی محدود نہیں رہی۔ جیسے پچھلے سال اسرائیلی جارحیت نے روسی بیڑے کو بحیرہ روم میں آنے کا موقع دے دیا تھا اسی طرح امریکہ کی موجودگی نے ہمارے سمندر میں بھی روس کی آمد کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ بھارت میں روس اور امریکہ بظاہر ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ وہ دونوں اپنی اپنی اغراض کی بنا پر بھارت کو ساز و سامانِ جنگ مہیا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن دراصل وہ ایک دوسرے کے روبرو ہیں۔ دونوں میں بھارت کو اپنانے کے لئے دوڑ لگی ہوئی ہے۔ یہ دوڑ اب خشکی سے تری تک پہنچ گئی ہے اور بھارتی بحریہ کی تنظیم نو اور توسیع کی ذمہ داری بہت حد تک روس کے سپرد ہو گئی ہے۔ اس طرح سمندر میں ایک عجیب تکون کام کرنے لگی ہے۔ بھارت، روس اور امریکہ تینوں اس کے اضلاع ہیں۔ ان میں اغراض کا اشتراک بھی ہے اور تصادم بھی۔ اور اشتراک اور تصادم دونوں کی حدیں خلط ملط ہو گئی ہیں۔ جسے ایک اشتراک کہنا چاہے گا اسے دوسرا بڑی آسانی سے تصادم متصور کرے گا۔ بھارت اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ روس اور امریکہ میں تصادم ہو تو، اور اشتراک ہو تو، اسے دونوں صورتوں میں فائدہ ہی پہنچے گا کیونکہ دونوں بہرحال اس کا گھر بھرنے میں لگے رہیں گے۔ لیکن ایسے نظر آتا ہے کہ بھارت کا نقشہ بھی آخر کار چین جیسا ہو گا۔ اور امریکہ اور روس کا وجود دائیں اور بائیں بازو کے مقابلے اور تصادم کو فروغ دیگا۔

نتیجہ کچھ بھی ہو اس استعماری کھیل کا خاموشی سے تماشہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس کے مضمرات سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت پوری کئے بغیر چارہ نہیں۔ ایسا نہ کیا گیا تو اس کا خمیازہ ان تمام اقوام و ممالک کو بھگتنا ہوگا جو اس سمندر کے کنارے آباد ہیں۔ اس خطرے کو قدرتی طور پر پاکستان نے بھانپا ہے۔ اسی پر اس کی براہ راست اور فوری زد بھی پڑتی ہے لیکن اس سے جو ردِ عمل ابھر رہا ہے وہ عالمی سیاست کے محرکات سے یکسر بے خبری کی دلیل ہے۔ اقبالؔ نے بہت پہلے کہا تھا۔

ترا ناداں رسیدِ غمگساری ہا ز افرنگ است
دلِ شاہیں نہ سوزد بہرِ آں مرغے کہ در چنگ است

ہمارے اہل الرائے یوں سمجھتے نہیں تو کہہ ہی رہے ہیں کہ امریکہ تو خیر پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہے اور اس کی بھارت سے ملی بھگت ہے، روس شاید اس لئے اس ڈرامے کا کردار بن گیا ہے کہ اسے ٹھیک طرح معلوم نہیں کہ بھارت اور روس کا کردار کس حد تک پاکستان کے مفاد کے منافی ہے۔ چنانچہ سفارتی اور صحافتی سطح پر مساعی کی جا رہی ہیں کہ روس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ کسی پرندے کو کوئی شاہین اپنے پنجے میں لے تو اسکے زخمی ہونے اور جان سے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ لہٰذا شاہین کو اس ظلم سے باز رہنا چاہیئے۔ روس کے سامنے صدیوں سے یہ مسئلہ چلا آ رہا ہے کہ وہ کیسے بحیرہ روم اور بحیرہ عرب کے کھلے سمندروں میں پہنچے اور ان علاقوں میں اپنی قوت کا مظاہرہ کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلائے۔ ایسا ہی ــــ قابلِ فہم ــــ عزم لے کر وہ چین پہنچا تھا اور امریکہ کا راستہ روکنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر عنصرِ چین سے خود نگر اور خود دار قیادت ابھر کر روس کا راستہ نہ روک دیتی تو آج چین روس کا طفیلی ملک ہوتا۔ اسی بنا پر روس نے عربوں کی حمایت کی اور بحیرہ روم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ بھارت کی عیاری سے کم اور ہماری سادگی سے زیادہ وہ کشمیر کو اپنے زیر اثر لے آیا ہے اور اب بھارت کی مدد کے بہانے ہمارے سمندروں میں پہنچنے لگا ہے۔ روس کی حکمت عملی صدیوں کے بعد رنگ لائی ہے۔ اس کامیابی سے کسی اور کو کچھ نقصان بھی کیوں نہ پہنچے، روس کو اس کے لئے مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ اسے کس بنا پر امریکہ کے روبرو ہونے سے روکا جا سکتا ہے؟ وہ کسی کے کہنے میں آ کر اور کسی کے مفاد کی خاطر اپنے مفاد سے تو دستبردار نہیں ہونے لگے گا۔

سوال کسی کو روکنے کا ہے بھی نہیں، سوال اپنے گھر کی خبر لینے اور اس کی حفاظت کے لئے حقیقت پسندانہ اقدامات کرنے کا ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے جو ممالک اس سمندر کے کناروں پر آباد ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ مل کر اس سمندر میں اپنی جگہ پیدا کریں۔ اس سمندر میں آنے سے انہیں کوئی روک نہیں سکے گا۔ جوں جوں وہ قدم جماتے جائیں گے ان کا حق موجودگی تسلیم ہوتا جائے گا اور اس کا امکان بڑھتا جائے گا کہ وہ استعمار کے دیو استبداد کی

پائے کوبی کی رفتار اور اس کا دائرہ کم سے کمتر کرتے جائیں۔ استعمار کی مکمل پسپائی کا یہ پیش خیمہ ہوگا لیکن یہ اسوقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک ایک مشترکہ افریقی ایشیائی بحری لائحہ عمل وضع نہ کر لیا جائے۔ دیکھا جائے تو یہ پورے ایشیا اور پورے افریقہ کا معاملہ ہے۔ بحیرہ عرب ہی نہیں خلیج فارس اور بحیرہ قلزم کے ممالک پر بھی اس کی براہ راست زد پڑتی ہے۔ اب بطور خاص اس لئے کہ برطانیہ ان علاقوں سے بھی پسپا ہو رہا ہے اور وہ خلاء کا ہوا کھڑا کر کے ان کو اس پر آمادہ کر رہا ہے کہ وہ اس کی استعماری کھڑاویں اپنے سامنے رکھیں اور اپنی حفاظت کی تدابیر برطانیہ سے سیکھیں اور انہیں بروئے کار لائیں۔ اس لائحہ عمل کا قدم اول یہ ہونا چاہیئے کہ یہ بحر — بحر ہند نہیں بحر افریشیا ہے۔ موجودہ نام سے غیر شعوری طور پر یہ بحر ایک ایسے ملک سے منسوب ہو جاتا ہے جس کا اجارہ دارانہ حق ملکیت نہ وہ اعلانیہ طور پر منوا سکے گا، نہ مانا جا سکتا ہے۔ اس کا نام بدلنے سے ایشیا اور افریقہ کی مجموعی دلچسپی اس سمندر میں بڑھے گی اور وہ باہمی تعاون سے اپنے مفاد کی نگہداشت کے لئے کوئی عملی اور مؤثر لائحہ عمل مرتب کر سکیں گے۔ وہ مل کر اس میں دلچسپی لینے لگیں تو ایک تو انہیں کوئی روک نہیں سکے گا۔ دوسرے روس، جو اپنے قابلِ فہم مفاد کی خاطر بھارت کو عظیم بحری طاقت بنائے چلا جا رہا ہے، مجبور ہوگا کہ ایشیا اور افریقہ کے قابلِ فہم مفاد سے اپنے مفاد کو ہم آہنگ کرے۔ وہ اپنی توجہ کم دبیش بھارت سے نہ بھی ہٹائے تو ادھر ضرور توجہ دے گا۔ یہ افریشیائی ممالک کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ وہ فہم و فراست کے ایسے عملی مظاہرے سے تو روس کو اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کر سکتے ہیں لیکن اخلاقی درخواستیں کرنے سے اس کے رویہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ اس سے تو الٹا یہ نقصان پہنچ سکتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ روس جیسی صف اول کی طاقت کے منہ آنے لگیں اور اس کی دشمنی مول لیں۔ دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ روس کے مفاد کو سمجھا جائے، اپنے اور اسکے مفاد میں قدر مشترک تلاش کی جائے اور روس کو امریکہ کے روبرو رکھا جائے۔ اس طرح استعمار کا محاذ بھی کمزور ہوگا، اور افریشیائی اقوام کے اپنے آپ میں آنے کے واضح آثار بھی پیدا ہوں گے۔ اقبال کے الفاظ میں، امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ — خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے! اس کے بغیر طرح طرح کے پاپڑ بیلیئے، گدائی کا کاسہ لے کے دنیا میں گھوم جایئے، سوائے روسیاہی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا — کچھ حاصل نہیں ہوگا!

ضرورت رشتہ

کشمیری خاندان کی قبول صورت، سادہ مزاج، عمر ۲۳ سال، تعلیم یافتہ (بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ) دوشیزہ کے لئے موزوں رشتہ مطلوب ہے۔

خط و کتابت کا پتہ:- (ف) معرفت طلوع اسلام - ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

حضرت شاہ ولی اللہ اور ملکیتِ زمین

(۱۱۱۴ھ .... ۱۱۷۶ھ)

سید جعفر شاہ صاحب پھلواری

یہ مقالہ یوم شاہ ولی اللہ کے موقع پر اس جلسے میں پڑھا گیا تھا جو جسٹس کارنیلیس کی صدارت میں جی۔ این۔ آر میں منعقد ہوا تھا!

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایک روشن خیال مفکر اور ایک دور بین محدث تھے۔ لیکن ان کی روشن خیالی ہمیشہ کتاب و سنت کی حدود کے اندر ہی رہی۔ وہ حکمتِ دینی کے دانائے راز تھے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا اسے فلسفہ و حکمت سے مزین و مبرہن کر کے لکھا۔ وہ اپنے افکار کے اظہار میں جرأت و ہمت سے کام لیتے تھے اور اس کی پروا نہ کرتے تھے کہ عوام ان کے تصورات کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ وہ صدیوں کے مسلمات کے پردے چاک کرتے ہوئے بھی کسی چہ میگوئی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مثلاً عرصہ دراز سے اہل علم کا ایک کثیر طبقہ قرآن میں ناسخ و منسوخ کا قائل رہا ہے اور اب بھی موجود ہے۔ اگر تمام منسوخات کو یکجا کیا جائے تو قرآن کریم کا ایک خاصا حصہ منسوخ قرار پا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ اسے برداشت نہ کر سکے اور واضح لفظوں میں لکھ دیا کہ صرف چار پانچ آیات کے متعلق یہ شبہ ہو سکتا ہے ورنہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں مختلف مواقع کے مناسب احکام ہیں جن میں ظاہر بینوں کو تضاد نظر آتا ہے۔ اُس دور میں شاہ صاحب کی یہی بڑی کامیابی تھی کہ منسوخات کی خاصی تعداد کو گھٹا کر چار، پانچ تک لے آئے تاکہ آئندہ کوئی اُٹھ کر ان چار پانچ کی منسوخی کو بھی منسوخ کر دے۔

شاہ صاحب کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اسلامی عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات کو ایسے حکیمانہ و مجتہدانہ انداز سے پیش کرتے ہیں کہ وہ ایک مربوط نظام اور عقل و حکمت کا ایک حسین مرقع نظر آتا ہے اور

آئندہ نسلوں کے لئے وہ روشنی کے مینار کا کام دیتا ہے۔ وہ اپنے افکار میں ایک طرف تو ماضی کی روایات سے وابستہ رہتے ہیں اور دوسری طرف کتاب وسنت کی حدود میں رہ کر حال کی مشکلات کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی مستقبل کے اس نصب العین پر بھی نظر جمائے رہتے ہیں جہاں اسلام کاروانِ انسانیت کو لے جانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کے افکار[1] دو صدیاں گزر چکنے کے بعد آج بھی تازہ دکھائی دیتے ہیں۔ آج کے دور میں ملکیت زمین کے مسئلے میں دنیا کے مفکرین جس مقام پر پہنچے ہیں شاہ صاحب وہاں بہت پہلے پہنچ چکے ہیں۔ ملکیتِ زمین کے متعلق پہلے کتاب وسنت کے فیصلے سن لیجئے۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ شاہ صاحب کتاب وسنت کی روح سے کس قدر پیوستہ ہیں اور دینی اسرار وحکم میں کیسی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔

جہاں تک میری ناقص نگاہ جا سکی ہے مجھے اسلام میں کسی شے کی ملکیت کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ملتا۔ قرآن کا ایک عمومی اور ہمہ گیر تصور یہ ہے کہ

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ۔

اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جان ومال کو بہشت کے عوض خرید لیا ہے۔

اس آیت کے بعد مومن کی کوئی چیز بھی اس کی اپنی نہیں رہتی۔ اب خاص زمین کے متعلق بھی کچھ قرآنی فیصلے سن لیجئے۔

ان الارض للہ : زمین اللہ کی ملک ہے۔

والارض وضعھا للانام : اس نے زمین کو تمام انسانوں کے فائدے کیلئے بنایا ہے

ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین : تمہارے لئے زمین میں ایک میعاد تک ٹھکانا اور فائدہ اٹھانا ہے۔

ان آیات سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ زمین پر ملکیت کسی انسان کی نہیں۔ یہ اللہ کی ملکیت ہے۔ کیونکہ وہی

---

[1] (حاشیہ صفحہ گزشتہ) مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے ان پانچ آیات میں تطبیق کر کے یہ بتایا کہ وہ بھی منسوخ نہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شاہ صاحب درحقیقت عقیدہ نسخ فی القرآن کے قائل نہیں تھے لیکن چونکہ وہ دور اسکا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے انہوں نے یہ روش اختیار کی۔ شاہ صاحب کی عظمتِ فکر کے اعتراف کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ ایک مجتہد کو اس قسم کی روش اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ اسے چاہیئے کہ جس بات کو حق سمجھتا ہے اسے بیباکانہ کہہ دے اور اگر وہ زمانے کی مخالفت کا حریف نہیں ہو سکتا تو اس قسم کی مفاہمت آمیز روش اختیار کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ خاموش رہے۔ یہ روش آنے والوں کے لئے گمراہی کا موجب بن جاتی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] سب کے سب نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

اس کا خالق ہے۔ دوسرے اس سے یہ ثابت ہوا کہ زمین سے فائدہ حاصل کرنا ایک ایسا حق ہے جس میں سارے انسان شریک ہیں۔ گویا انسان مالک کی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ صرف ایک امین ہے اور امین مالک نہیں ہوتا۔ خزانچی یا کیشیئر اپنے پاس ہزاروں روپیہ رکھتا ہے۔ ہزاروں لیتا ہے اور ہزاروں دیتا ہے۔ لیکن اس کے تصور کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ رقم اس کی ملکیت ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ جو حق المحنت اسے دیا جائے وہ اپنے استعمال میں لائے۔ جتنا اس کو دیا جائے وہ اسے حفاظت رکھ لے اور جتنا کسی کو دلوایا جائے بے تامل دے دے۔ اگر کیشیئر ملکیت کا تصور پیدا کرے، تو وہ خازن نہیں، خائن ہوگا۔ انسان کی حیثیت اس دنیا میں ایک کیشیئر یا خزانچی سے زیادہ کچھ نہیں۔

اب زمین کے متعلق چند احادیث نبویؐ بھی سنیئے۔ حضرت عروہ فرماتے ہیں۔

اشهد ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قضى ان الارض ارض الله والعباد عباد الله۔ (رواہ الطبرانی)

میں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضورؐ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ زمین بھی اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔

یعنی دونوں اللہ کی ملکیت ہیں۔ زمین بے اختیار ہے اور بندے با اختیار۔ بے اختیار زمین پر با اختیار بندوں کو فائدہ حاصل کرنے کا یکساں حق ہے۔ اگر کوئی بندہ لامحدود رقبہ زمین پر قابض ہو کر دوسرے بندوں کا حق مارتا ہے تو وہ خائن بھی ہے، ظالم بھی۔ زمین کسی فرد کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ یہ سب کے فائدے کے لئے وقف ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور حدیث بھی سنیئے:۔

جعلت لى الارض طيبة طهورا و مسجدا (رواہ مسلم عن جابر بن عبداللہ الانصاری)

زمین میرے (یعنی میری ساری امت کے) لئے پاک اور مسجد بنائی گئی ہے۔

اس ارشاد نبویؐ میں دو حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں چاہو نماز ادا کر سکتے ہو۔ دوسرے یہ کہ جس طرح مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی اسی طرح یہ زمین بھی کسی کی ملکیت نہیں۔ سارے انسانوں کا اس پر یکساں حق ہے۔

اس کی تشریح حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زبان سے سنیئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

الارض فى الحقيقة بمنزلة مسجد او رباط جعل وقفا لابناء السبيل و هم شركاء فيه فيقدم الاسبق فالاسبق۔ ومعنى الملك فى حق الآدمى

کونہ احق بالانتفاع من غیرہ۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ابواب ابتغاء الرزق)

یہ زمین مسجد یا مسافر خانے جیسی حیثیت رکھتی ہے جو تمام مسافروں کے لئے وقف ہے اور وہ سب اس میں یکساں شریک وحقدار ہیں پس جو پہلے آئے گا اسے بعد میں آنے والے پر مقدم رکھا جائے گا۔ اور آدمی کی ملکیت ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کا بہ نسبت دوسرے کے زیادہ حقدار ہے۔

شاہ صاحب نے ایک تو زمین کے مسجد ہونے کا مطلب واضح کر دیا۔ دوسرے ملکیت کا مفہوم بھی بتا دیا کہ اس سے مراد صرف فائدہ اٹھانا ہے۔ آپ نے شاہ صاحب کی پرواز فکر اور روحِ دین کے فہم کا اندازہ کر لیا ہوگا کہ وہ کتنا بلند اور حکیمانہ ہے۔

مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی۔ ہاں اس کا متولی ہوتا ہے اور منتظمین ہوتے ہیں۔ اسی طرح زمین بھی صرف خدا کی ملکیت ہے اور بندے اس کے امین اور منتظم کار ہیں۔ اگر منتظم عادل نہ ہو تو اسے غاصب کہا جائے گا۔ تقاضائے عدل یہ ہے کہ کسی کے مصرف میں اتنی زیادہ زمین نہ ہو جسے وہ خود آباد یا کاشت نہ کر سکے یا اس کی ضرورت سے زیادہ ہو اور دوسرے اس سے محروم ہو جائیں۔ اگر کوئی شخص زمین کا کوئی حصہ بے کار رکھ چھوڑے تو معاشرے کو حق ہے کہ وہ اس سے واپس لے کر کسی ایسے شخص کو دے جو اسے کام میں لائے۔ حضرت بلال بن حارث مزنی کو آنحضورؐ نے خود قدس نامی زرعی مرتفع زمین مرحمت فرمائی تھی۔ سیدنا عمر بن خطابؓ نے ان سے وہ زمین اپنے عہد میں صرف اس لئے واپس لے لی کہ انہوں نے اسے آباد نہ کیا تھا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ عین مطابق سنت تھا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

(۱) من کانت لہ ارض فلیزرعھا او لیمنحھا اخاہ .... (ابن ماجہ عن ابی ہریرہ)

جس کے پاس کوئی زمین ہو وہ یا تو خود کاشت کرے یا اپنے دوسرے بھائی کو (کاشت کے لئے) دیدے۔

اس کے علاوہ زاید از ضرورت زمین رکھنے میں ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ جو خود کاشت نہ کر سکے گا وہ مزارعین سے بٹائی پر کاشت کرائے گا جسے مخابرہ، مزارعہ یا مساقات وغیرہ کہتے ہیں۔ اس کا رواج آج تک ہمارے معاشرے میں جاری ہے۔ لیکن آیئے ذرا اس بٹائی یا مخابرے کے بارے میں بھی چند احکام سن لیجئے۔

(۲) عن زید بن ثابت قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المخابرۃ۔

قلت ما المخابرۃ؟ قال ان تاخذ الارض بنصف او ثلث او ربع۔

حضرت زید بن ثابت کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ نے مخابرے سے منع فرمایا تو میں نے دریافت

کیا کہ مخابرے کا کیا مطلب ہے؟ ارشاد فرمایا کہ زمین کو نصف، تہائی یا چوتھائی پیداوار پر لینا۔
دوسری حدیث بھی سنیئے:۔

(۳) عن جابر بن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من لم یذر المخابرۃ فلیؤذن بحرب من اللہ و رسولہ۔

جابر بن عبداللہ (انصاری) کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: جو بٹائی کا کام ترک نہیں کرتا وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

یہ وہی تہدیدی الفاظ ہیں جو سود خواروں کے لئے قرآن میں آئے ہیں (فأذنوا بحرب من اللہ و رسولہ)۔
اس سے بھی زیادہ واضح ارشاد نبویؐ سنیئے:۔

(۴) عن ابن ابی نعیم قال حدثنی رافع بن خدیج انہ زرع ارضا فمرّ بہ النبیّ صلے اللہ علیہ وسلم وھو یسقیھا۔ فسألہ لمن الزرع ولمن الارض؟ فقال زرعی ببذری وعملی، لی الشطر ولبنی فلان الشطر۔ فقال اربیتما۔ فردّ الارض علے اھلھا وخذ نفقتک۔

ابن ابی نعیم، رافع بن خدیج (انصاری) کا بیان کردہ واقعہ یوں دہراتے ہیں کہ رافع نے ایک زمین پر کاشت کی۔ وہ اس کی آبیاری کر رہے تھے کہ حضورؐ ادھر سے گزرے اور پوچھا کہ یہ کھیتی کس کی ہے اور یہ زمین کس کی ہے؟ رافع نے کہا۔ میری یہ کھیتی میرے بیج اور میری ہی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا (جس کی یہ زمین ہے)۔ حضورؐ نے فرمایا۔ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ لہٰذا زمین تو صاحب زمین کو واپس کر دو۔ اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔

کیا اس کے بعد بھی کچھ اور کہنے کی ضرورت رہ گئی ہے اور کیا اب بھی اس میں کوئی شک باقی رہ جاتا ہے کہ بٹائی کا کام سراسر سودی کاروبار ہے؟ یہ تینوں روایتیں سنن ابی داؤد کی کتاب البیوع جلد دوم میں موجود ہیں اور معلوم نہیں کیوں ان روایات کو عموماً عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا گیا؟ اور لطف یہ ہے کہ جابر بن عبداللہ اور رافع بن خدیج دونوں انصار ہیں جن کا سابق مشغلہ زمینداری تھا اور وہی دونوں یہ حدیثیں روایت کرتے ہیں اور اپنے مفاد کی کوئی پروا نہیں کرتے کیونکہ اطاعتِ رسولؐ انہیں اپنے مفاد سے زیادہ عزیز تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے رافع کی حدیث سنی تو انہوں نے بھی بٹائی ترک کر دی۔ (صحاح وسنن)

یہ صحیح ہے کہ آج کے مشینی دور میں ایک آدمی سینکڑوں ایکڑ زمین کی کاشت آسانی سے کر سکتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس پیداوار میں خود اس کا اپنا حصہ کتنا ہونا چاہیئے؟ اگر وہ زاید از ضرورت غلّے کی ذخیرہ اندوزی اور احتکار کرتا ہے تو یہ سود خوری سے کم تر جرم نہیں۔ ہاں اگر وہ زاید از ضرورت پیداوار کو ان لوگوں کے لئے کھلا رکھتا ہے جن کے پاس ضرورت سے کم ہے تو یہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ عین عبادت ہے، عین دیانت داری ہے۔ اندوختگی برائے اندوختگی حرام ہے۔ اندوختگی برائے انفاق فی سبیل اللہ عین ایمان ہے۔ اور اس کی تصدیق اس کے اپنے معیار زندگی سے ہوگی۔ جاگیرداری صرف اس وقت درست ہو سکتی ہے جب جاگیردار اپنے آپ کو مالک نہ سمجھے بلکہ عمل سے اپنے آپ کو امین ثابت کرے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے، جیسا کہ موجودہ دور میں نظر آتا ہے تو اس کے لئے اسلام میں کوئی جواز نہیں۔ دولت خواہ روپے کی شکل میں ہو یا کسی جائیداد کی شکل میں، جب اکتناز کی صورت اختیار کرے گی تو وہ ناجائز کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اسلام اگر فساد فی الارض کو دور کرنا چاہتا ہے تو وہ اس معاشی ناہمواری کو کیونکر گوارا کر سکتا ہے جو فساد فی الارض کا سب سے بڑا سبب ہے؟ اسلام اگر معاشرتی عدل و سوشل جسٹس قائم کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسی لامحدود ملکیت کے جواز کا کیسے فتوےٰ دے سکتا ہے جس سے بڑھ کر زیادہ معاشرتی ناانصافی کوئی نہیں؟

دنیا کی تاریخ میں فساد کا سب سے بڑا سبب تصورِ ملکیت ہی رہا ہے۔ آپ کے مکان میں اگر کوئی شخص بلا اجازت گھس کر اپنا بستر لگا لے تو آپ اس سے جھگڑ پڑیں گے کیونکہ آپ اسے اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ لیکن سڑک پر وہ بھی چلتا ہے، آپ بھی چلتے ہیں۔ دریا میں وہ بھی غسل کرتا ہے، آپ بھی نہاتے ہیں۔ پارک میں آپ بھی سیر کرتے ہیں، وہ بھی ٹہلتا ہے۔ ہوا میں وہ بھی سانس لیتا ہے آپ بھی لیتے ہیں۔ سورج کی حرارت سے وہ بھی فائدہ اٹھاتا ہے آپ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مسجد میں آپ بھی نماز ادا کرتے ہیں، وہ بھی ادا کرتا ہے۔ مگر کہیں آپ دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا فساد نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہاں انفرادی ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ جھگڑا فساد وہیں ہوتا ہے جہاں انفرادی ملکیت کا تصور موجود ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے لہٗ ملک السمٰوٰت و الارض۔ فرما کر انسانی ملکیت کی پوری نفی کر دی ہے اور زمین کو ایک امانت قرار دے کر اس کے استعمال و تقسیم میں عدل و انصاف کو لازم کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نیشنلائزیشن کے معنی اگر "قومی ملکیت" کے ہیں تو یہ اجتماعی ملکیت بھی کوئی اسلامی تصور نہیں۔ قوم یا اس کی نمائندہ حکومت صرف امین، منتظم اور کسٹوڈین ہے نہ کہ صاحبِ ملکیت۔

لہ کھلا رکھنے کے معنی فروخت کے لئے کھلا رکھنا نہیں۔ اپنی ضروریات سے زاید کسی کے پاس کچھ رہنا ہی نہیں چاہیئے۔ وہ ضرورتمندوں کے لئے ہے جسے وہ خریدیں نہیں بلکہ بطور اپنے حق کے لے سکتے ہیں۔ یہی قرآن کا معاشی نظام ہے۔ (طلوع اسلام)

ایک صاحب نے فتویٰ دیا کہ اگر زکوٰۃ نکلتی رہے تو لامحدود روپے اور لامحدود زمین بھی میں اسلام ہے۔ انہیں اس لامحدود انفرادی ملکیت کے حق میں کوئی قرآنی دلیل نہ مل سکی۔ صرف ایک دلیل ملی اور وہ یہ کہ اگر انفرادی ملکیت کا وجود نہ تسلیم کیا جائے تو قرآن نے جو قانونِ وراثت دیا ہے وہ کیسے باقی رہیگا؟ بہت خوب! یعنی دنیا میں غربت و افلاس ضرور باقی رہنا چاہیئے ورنہ زکوٰۃ کا قرآنی حکم کدھر جائے گا۔ کفر باقی رہنا ضروری ہے ورنہ جہاد و قتال کا قرآنی ارشاد بے معنی ہو جائے گا۔ زنا اور چوری کو باقی رکھنا بھی ضروری ہے ورنہ قرآنی حدیں کیسے لگائی جائیں گی؟ آخر اتنی سی بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ وراثت کسی ملکیت کی تقسیم نہیں، امانت کی تقسیم ہے اور وہ بھی برائے انتفاع نہ کہ بطور ملکیت۔ پھر اگر قانونِ وراثت تمام مسلمانوں کے لئے ہے تو اس کا واضح مطلب تو یہی ہے کہ ہر مسلمان کے پاس زمین ہونی چاہیئے نہ کہ صرف چند جاگیرداروں کے پاس۔

معاملہ صرف بٹائی کا نہیں بلکہ ہمارا موجودہ معاشی نظام سارا کا سارا سودی کاروبار ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ۱۔ بینکنگ، ۲۔ حکومتی قرضے، ۳۔ مضاربت، ۴۔ مزارعت، ۵۔ تجارت، ۶۔ اور کرائے وغیرہ سب ہی کے اندر وہ اسباب موجود ہیں جن کی وجہ سے ربا خواری حرام کی گئی ہے۔ مفت خوری (SLEEPING PARTNER-SHIP) استحصال و استغلال، ضرورتمندوں کی مجبوری سے خود غرضانہ فائدہ اٹھانے کا جذبہ، قساوت و بے رحمی، راس المال سے زیادہ کی جبری وصولی، انسانیت کشی اور امیر و غریب کے دو طبقوں میں انسانی تقسیم اور معاشی ہمواری کا خون۔ یہ ساری باتیں سود خواری کی طرح ان چیزوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے اہل تقویٰ صرف "کمرشل انٹرسٹ" کو حرام بتاتے ہیں اور باقی تمام سود خواریوں کو صرف نام بدل کر عین اسلام قرار دیتے ہیں۔ اور ملکیتِ زمین کا غیر اسلامی تصور ایجاد کر کے بٹائی کی آمدنی کو لقمۂ حلال بنا لیتے ہیں[1]۔ کاش یہ حضرات مذکورہ بالا احادیثِ نبویؐ کی روشنی میں شاہ ولی اللہ کا فتویٰ بھی دیکھ لیتے تو ہمیں یہ شعر پڑھنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ ؎

پہلے مفتی تھے مسائل کے بتانے والے
اب بھی مفتی ہیں مگر مفت کے کھانے والے

---

[1] جیسا کہ ہم شروع سے لکھتے چلے آ رہے ہیں، معاوضہ محنت کا ہے، سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ پر جو بڑھوتی بھی ہوگی وہ ربوٰ ہوگی لہٰذا حرام، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ (طلوع اسلام)

نقد و نظر

ENGLISH TRACED TO ARABIC

دنیائے لسانیات میں ایک خیال یہ بھی رائج ہے کہ عربی زبان ام الالسنہ ہے۔ یعنی عربی، نوع انسان کی بنیادی زبان تھی اور باقی سب زبانیں اسی پر متفرع ہیں۔ یہ ایک علمی نظریہ ہے اور علمی تحقیق کا محتاج۔ اگر یہ نظریہ صحیح ثابت ہو جائے تو علم الالسنہ میں ایک مسلّمہ کا اضافہ ہو جائے گا۔ دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک عربی زبان کی اہمیت اس لئے ہے کہ قرآن کریم اس زبان میں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی کتاب کی زبان کو نہ سمجھا جائے، وہ کتاب سمجھ میں آ نہیں سکتی۔ اس اعتبار سے اس زبان کی تحصیل مسلمانوں کے لئے نہایت ضروری ہے، بلا لحاظ اس امر کے کہ یہ ام الالسنہ ہے یا نہیں۔ البتہ اس زبان کی جامعیت ایک امر مسلّمہ ہے۔ یہی زبان، قرآن جیسی کتاب کی ـــ جس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں ـــ متحمل ہو سکتی تھی۔

زیر تبصرہ کتاب محمد احمد مظہر صاحب (ایڈووکیٹ) کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں انہوں نے شروع میں عربی زبان کی اہمیت، اور باقی زبانوں کے مقابلہ میں اس کی افضلیت پر بحث کی ہے اور اس کے بعد انگریزی کے ان الفاظ پر مشتمل ایک ڈکشنری مرتب کی گئی ہے جن کی اصل (مصنف کی تحقیق کے مطابق) عربی زبان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض الفاظ کے ضمن میں کہا جا سکے کہ یہ استنباط قیاسی ہے لیکن اسمیں کوئی کلام نہیں کہ مصنف نے اس میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے اور مختلف زبانوں پر اس کی نگاہ بڑی عمیق ہے۔ کتاب سفید کاغذ پر چھپی ہے اور طباعت بھی روشن ہے۔ کور بکس بورڈ کا ہے اور قیمت پندرہ روپے (۱۵/-) جو مصنف کی دیدہ ریزی کا بدل نہیں ہو سکتی۔

اتنا اضافہ ضروری ہے کہ یہ کتاب عام قارئین کے مطلب کی نہیں۔ صرف علمی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ محمد احمد اکادمی۔ رام گلی ۳۔ لاہور

علاج بالقرآن

مسلمانوں نے خدا کی کتابِ عظیم کے ساتھ (معاذ اللہ) جو مذاق کر رکھا ہے (اور جس کا نتیجہ یہ قوم صدیوں سے بھگت رہی ہے) اس کی ایک بین مثال زیرِ نظر کتابچہ ہے۔ یہ درحقیقت حکیم حافظ محمد یوسف رشید چغتائی کھروڑ پکا کے رسالہ الشفاء کا قرآن نمبر ہے۔ اس میں سر سے پاؤں تک کی تمام بیماریوں کا علاج، قرآن کریم کی مختلف آیات کے ورد کرنے سے بتایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دو ایک نسخے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ صفحہ ۲۹ پر لکھا ہے۔

ڈاڑھی کے بال نہ اُگیں یا کمی ہو تو ہر نماز فرض کے بعد آیت مبارکہ لا تاخذ بلحیتی ولا برأسی انی خشیت ان تقول فرق بین بنی اسرائیل۔ تین بار پڑھ کر اور دونوں ہاتھوں پر دم کر کے چہرہ پر پھیریں۔

یا مثلاً۔

بھوک کی کمی، بھوک کا نہ لگنا۔ پارہ ۱۹۔ سورۃ شعراء کی آیت مبارکہ ھو یطعمنی و یسقینی اکتالیس بار کھانے پر دم کر کے کھائیں۔

(اس سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ مُلّا حضرات اتنا کھانے کس طرح ہیں؟)

حتیٰ کہ اس میں سستی و نامردی کے لئے بھی قرآنی آیات کا ورد درج ہے۔ اور (معاف کیجئے) عورتوں کے پستانوں کے ابھار کے لئے بھی۔ (یہ جنسی بدنہادی۔ SEX - PERVERSION کی انتہا ہے)

ہم ان حضرات سے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اور کچھ نہیں تو کچھ خدا سے ہی شرم کیجئے۔

(•)

تجارتی سود۔ تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے

مصنف۔ فضل الرحمٰن صاحب۔ لکچرر شعبۂ سُنی دینیات۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔ شائع کردہ۔ یونیورسٹی پبلیکیشنز۔ ظہور دارڑ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ کتاب پر قیمت درج نہیں۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے ہمارے ہاں یہ بحث چلی تھی کہ تجارتی سود (کمرشل انٹرسٹ) اُس ربوٰ میں شامل نہیں جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کی طرف سے، مولانا محمد جعفر شاہ صاحب کا مجموعہ مضامین ۔۔۔ کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت ۔۔۔ کے عنوان سے شائع ہوا

تھا۔ ہم نے اس مسئلہ پر عمومی بحث کرتے ہوئے (طلوع اسلام میں) نہایت وضاحت سے لکھا تھا کہ مقصد استقراض (یعنی وہ مقصد جس کے لئے قرض لیا جاتے) کی بنیاد پر ربٰو کو حرام یا حلال میں تقسیم کرنا، قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ ربٰو، ربٰو ہی ہے خواہ قرضخواہ کسی مقصد کے لئے قرض لے۔ اور ربٰو کے معنی ہیں اصل زر پر بڑھوتی۔ خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ قرضہ پر بڑھوتی۔ مکانوں کا کرایہ۔ زمین کی پیداوار میں حصہ (بٹائی) یا تجارت میں محض روپیہ لگا کر منافع میں شرکت — سب ربٰو میں داخل ہیں۔ قرآن اپنا مخصوص معاشی نظام رکھتا ہے جس میں معاوضہ محنت کا ہے، سرمایہ کا نہیں، اور جب کسی ملک میں قرآن کا معاشی نظام رائج ہو تو وہاں سرمایہ پر منافع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ قرآن کے معاشی نظام میں کسی کے پاس فالتو دولت (SURPLUS MONEY) رہ ہی نہیں سکتی۔ اس لئے سرمایہ پر منافع کے کیا معنی؟

فضل الرحمن صاحب نے مولانا جعفر شاہ صاحب کی مذکورہ صدر کتاب پر تبصرہ کیا ہے اور زیر تبصرہ کتاب اس تبصرہ پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے تاریخ، روایات اور فقہ کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ربٰو کی تجارتی اور غیر تجارتی تفریق اصولی طور پر غلط ہے۔ ربٰو حرام ہے خواہ مقروض کسی مقصد کے لئے بھی قرض کیوں نہ لے۔ تنقید کا انداز سلجھا ہوا ہے اور مصنف نے اپنے مسلک کی وضاحت میں کاوش سے کام لیا ہے۔

لیکن مصنف کا صرف انداز بیان ہی جدید ہے۔ مسلک وہی قدامت پرستانہ ہے اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ درحقیقت اسی قدامت پرستی کی مدافعت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سود کو تو حرام قرار دیتے ہیں، لیکن مضاربت (تجارت میں سرمایہ لگا کر نفع میں شرکت) یا مزارعت (زمین کی بٹائی وغیرہ) کو جائز ٹھہراتے ہیں۔ بر اس لئے کہ اسلاف نے انہیں جائز قرار دیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب ذہنیت یہ ٹھہرے کہ جو کچھ اسلاف نے کہا ہے اسے ہر حال "صحیح ثابت کر دیا جائے" تو اس میں اگر کسی ایسی بات کو بھی صحیح ثابت کیا گیا ہے جو فی الواقعہ صحیح ہے تو بھی یہ بات در خور تحسین نہیں قرار پا سکتی۔ صحیح مسلک یہ ہونا چاہیئے کہ دین کے معاملہ میں کسوٹی خدا کی کتاب ہے۔ اسلاف یا اخلاف میں سے جس کی جو بات اس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غلط۔ جب تک یہ روش اختیار نہیں کی جائے گی، کسی کی کوئی تحقیق دینی نقطۂ نگاہ سے مستحق تبریک قرار نہیں پائے گی۔

رؤیت ہلال

دو سال اُدھر عید کے چاند کے سلسلہ میں، ملک میں جو ہڑبونگ مچانے کی کوشش کی گئی تھی، وہ تو اس

ہنگامہ خیزی کے بعد فرو ہو گئی لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ملک کے سنجیدہ طبقہ نے اس مسئلہ پر علمی حیثیت سے غور کرنا ضروری سمجھا۔ زیر نظر کتابچہ اسی غور و تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس میں مولانا جعفر شاہ صاحب نے تحقیق و کاوش سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ چاند کے معاملہ میں فلکیاتی حساب ویسا ہی قابلِ اعتماد ہے جیسا کہ آنکھوں سے دیکھ کر معلوم کرنا۔ لہٰذا اگر کوئی اسلامی ملک، حسابی قاعدہ کی رو سے قمری تاریخوں کا فیصلہ کرلے تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا بالکل صحیح ہوگا۔ شاہ صاحب کا انداز سلجھا ہوا اور اسلوب نہایت متین اور سنجیدہ ہے (حالانکہ اس میں بالواسطہ تنقید اس جماعتِ اسلامی کے مسلک پر ہے جس کے ہاں تنقید سے مراد ہی فریق مخالف کی تضحیک و تذلیل اور استحقار و استہزاء ہوتی ہے)

شاہ صاحب نے علامہ ابن دقیق کا یہ قول نقل کرنے کے بعد ۔۔۔ کہ نماز میں بھی حساب کتاب پر اعتماد ناجائز ہے ۔۔۔ لکھا ہے۔

> گویا بیشتر مسجدوں میں جو نماز کے اوقات نامے آویزاں ہوتے ہیں وہ سراسر ناجائز ہوتے ہیں لہٰذا علمائے کرام کو ان کے ناجائز ہونے پر اتنا ہی ۔۔۔ بلکہ اس سے زیادہ ۔۔۔ زور دینا چاہیئے جتنا وہ تقویم ہلال کے ناجائز ہونے پر زور دیتے ہیں۔

اطلاعاً تحریر ہے کہ "حضرات علمائے کرام" (خدا کے فضل سے) اس طرف بھی متوجہ ہو رہے ہیں۔ چنانچہ شیخوپورہ کے جماعت اہل حدیث کے امیر مولوی محمد حسین صاحب نے یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے کہ

> تحقیق کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے اذانیں دیں اور نمازیں ادا کیں بحساب اوقات گھڑیاں مروجہ کے اور ترک کیا سنت رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی کو اور نہ حساب رکھا سایہ کا واسطے اذان اور نماز کے روزانہ اور توڑا تعلق سنت سے براہ راست۔

پھر ارشاد ہوا۔

> اور وہ لوگ بھی ظالم ہو کر کافر ہوئے جنہوں نے مسجدوں میں گھڑیاں لٹکا دیں اور پھر مسجدوں پر رات اور دن کے حصے میں تالے لگا دیئے اور وہ لوگ بھی شیطان کے پیروکار ہو کر کافر ہوئے جنہوں نے ڈاڑھی مونڈھی یا مونڈھوائی اور مطمئن ہوئے۔
>
> (بحوالہ پیغام صلح ۔ ۱۹ ۳/۴۸)

امید ہے اب شاہ صاحب کو ان حضرات سے کوئی شکایت نہیں رہی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں شریعت کے نام پر جس قدر انتشار پیدا کیا جاتا ہے۔ اسکی بنیادی

باقی صفحہ (۴۴) پر ملاحظہ ہو

مطالب الفرقان کے جملہ حقوق محفوظ ہیں

مطالب الفرقان

انتیسواں پارہ۔ سابقہ شمارہ سے مسلسل

سورۃ المدثر (۷۴)

(۱) اے وہ کہ جس کے ذمے، عالم انسانیت کو سنوار کر، ایک جہانِ نو کو وجود میں لانا، اور اس طرح حق کے نظام کو ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے۔

(۲) اُٹھ! اور خود فراموش انسانوں کو ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔

(۳) اور خدا کے نظامِ ربوبیت کو اس طرح متمکن کر دے کہ کبریائی صرف اسی کے لئے ہو۔ (اسی سے خود تمہیں دنیا میں بڑائی حاصل ہو جائے گی۔ ۶۳/۸)

(۴) اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنی سیرت و کردار (شخصیت) کو نہایت پاکیزہ بنایا جائے، اور اس دعوت و تحریک کو ہر قسم کے ناپسندیدہ عناصر سے پاک و صاف رکھا جائے۔ (اس لئے کہ یہ کوئی ایسا میکانکی نظام نہیں کہ جس سے چاہا اسے چلا لیا۔ اس کے لئے خود اس دعوت کا صاف اور شفاف رہنا، اور اس میں شامل ہونے والوں کے قلب و نگاہ کا پاکیزہ ہونا، بنیادی شرط ہے)

(۵) اس قسم کے رفقاء کو ساتھ لے کر (۲/۱۲) ان کی ایسی تربیت کر کہ ان کی سیرت میں پختگی پیدا ہو جائے جس سے وہ اس بارِ عظیم کو آسانی سے اٹھا سکیں، اور ان کے پائے استقلال میں کہیں لغزش نہ پیدا ہونے پائے وہ اس بوجھ کو لے کر اٹھیں تو ان کی ٹانگیں لڑکھڑا نہ جائیں۔

(۶) اپنے رفقاء کو یہ بھی سمجھا دے کہ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تم اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں

کی نشوونما کے لئے کھلا رکھو اور کسی کو کبھی اس نیت سے نہ دو کہ یہ اُس پر احسان ہے جس کے بدلے میں وہ تمہیں اس سے زیادہ لوٹا کر دیگا۔ (۳۰/۳۹ ؛ ۷۶/۹)

(۷) یہ ہے وہ نظامِ ربوبیت، جس کے قیام اور بقا کے لئے تمہیں نہایت ثبات و استقامت سے سرگرمِ عمل رہنا، اور اس سکون و طمانیت سے آمادہ بمنزل ہونا ہے کہ تمہاری کشتی کہیں ڈگمگاتے نہیں۔

(۸) انہیں یہ بھی بتا دو کہ یہ دعوت، پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں بھری راہ ہے۔ ہر طرف سے اس کی مخالفت ہوگی ــــ اور سخت مخالفت) حتیٰ کہ اس میں ایسا وقت بھی آئے گا جب دشمن ہر طرف سے تمہیں ٹھوکریں ماریں گے۔ لڑائی کا بگل بجے گا اور تمہیں میدانِ جنگ میں آنا پڑیگا۔

(۹-۱۰) اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دو کہ اگرچہ اس تصادم میں سخت مشکلات کا سامنا ہوگا لیکن تمہارے لئے تمام مشکلات آسان ہو جائیں گی اور سختی تمہارے مخالفین ہی کے لئے ہوگی۔ تم کامیاب ہو گے اور انہیں شکست ہوگی۔

(۱۱)۔ اس دوران میں تمہارے مخالفین کی پوری پوری کوشش یہ ہوگی کہ وہ تمہیں ادھر اُدھر کی باتوں میں الجھائے رکھیں، اور اس طرح تمہیں اپنے تعمیری پروگرام میں آگے نہ بڑھنے دیں۔ لیکن تم ان سے الجھے بغیر، اپنی راہ چلتے جانا، ان سے ہمارا قانونِ مکافات خود نپٹ لے گا۔ ان مفاد پرست مخالفین کا سرغنہ وہ ہے جسے ہم نے بے سروسامان تنہا پیدا کیا تھا۔ یعنی یہ پیدائش ہی سے اپنے ساتھ وہ دولت اور قوت نہیں لایا تھا جس کے بل بوتے پر اس قدر سرکشی برت رہا ہے۔

(۱۲) پھر ہم نے بڑی کثرت سے اسے مال و دولت عطا کیا۔ (۷۴/۱۲)

(۱۳) اور وہ بیٹے جو اب ہماری مخالفت میں اپنا سارا زور لگا رہے ہیں۔ (ان امیرزادوں کی حالت یہ ہے کہ یہ کام کاج کے لئے کہیں باہر نہیں جاتے۔ ہر وقت گھر میں بیکار بیٹھے اس قسم کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔)

(۱۴) غرضیکہ ہم نے اس کے لئے زندگی کے راستے ہموار کر دیئے۔

(۱۵) لیکن اس پر بھی اس کی ہوس کی تسکین نہ ہوئی۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اسے اور زیادہ قوت اور دولت دیتے جائیں (اور وہ انکے بل بوتے پر حق کی مخالفت میں آگے ہی آگے بڑھتا جاتے)

(۱۶) لیکن اب ایسا ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ یہ ہمارے قوانین سے سرکشی برت رہا ہے۔

(۱۷) (اب اُس انقلاب کا زمانہ آرہا ہے جس میں) اسے سخت مشکلات اور مصائب کی گھاٹی چڑھنا ہوگا۔

(۱۸)۔ (جب یہ تمہارے پاس آیا تو تم نے اسے اس کا نفع نقصان اچھی طرح سمجھا دیا۔ اسے بتا دیا کہ اس کی غلط روش کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوگا۔ اور قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کس قدر خوشگواریاں حاصل ہوں گی۔ چنانچہ) اس نے اس پر غور کیا۔ دونوں راستوں کا باہمی مقابلہ کیا اور پھر اس بات کا اندازہ لگایا کہ کون سی راہ اس کے لئے فائدہ مند ہے

(۱۹-۲۰) لیکن یہ غارت ہو۔ اس نے اپنے لئے کس قدر غلط اندازہ لگایا؟ ایسا غلط اندازہ جس سے تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔

(۲۱) اس نے بارِ دگر اس دعوت پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔

(۲۲)۔ (اس کے سینے کی کشمکش کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہو گئے)۔ اس نے تیوری چڑھائی۔ منہ بسورا۔

(۲۳) اور نہایت سرکشی اور تکبر کے ساتھ پیٹھ پھیر کر، یہ کہتا ہوا چل دیا کہ

(۲۴) یہ غلط ہے (کہ یہ آسمانی وحی اور خدائی فیصلے ہیں) یہ پرانے زمانے کی دقیانوسی باتیں ہیں۔ یہ وہی جھوٹ ہے جو صدیوں سے اسی طرح متواتر چلا آرہا ہے۔

(۲۵) یہ سب باتیں اس شخص کی اپنی وضع کردہ ہیں (جنہیں یہ خدا کی وحی کہہ کر پیش کرتا ہے)۔

(۲۶)۔ (مفاد پرست گروہ کا یہ سرغنہ، یہ کچھ کہہ کر چلا گیا۔ اور اس کے پیچھے خدا کے قانونِ مکافات نے پکار کر کہا کہ تم دیکھو گے کہ) عنقریب اس کی دولت و حشمت کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ اسے جھلسا دینے والی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ جو اس کی ساری سختی کو پگھلا کر رکھ دے گی۔

(۲۷) تم جانتے ہو کہ وہ جھلسا اور پگھلا دینے والی آگ کیا ہوتی ہے اور کیا کر دیا کرتی ہے؟

(۲۸) وہ راکھ کا ڈھیر بنا دیا کرتی ہے۔ وہ کسی چیز کو نہیں چھوڑتی۔ اور جس تک پہنچ جائے اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہنے دیا کرتی۔ وہ نام و نشان تک مٹا دیا کرتی ہے۔

(۲۹) وہ اس طرح حلیہ بگاڑ دیتی ہے کہ اس کے بعد انسان پہچانا تک نہیں جاتا۔ (وہ ساری بساط الٹ کر نقشہ بدل دیا کرتی ہے۔)

(۳۰) اور یہ ایک ہی تباہی نہیں جسے بیان کیا گیا ہے۔ اس قسم کی بیسیوں تباہیاں ہیں (ایک یہ اور انہیں اس پر مستزاد)

(۳۱) یہ تباہیاں ہماری مقرر کردہ قوتیں ہی لاتی ہیں۔ اب رہا ان کی تعداد کا معاملہ تو ایسا محض تمثیلاً کہا گیا ہے۔ جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے، وہ اس تمثیلی بیان کو حقیقت پر محمول کر کے، اس پر اعتراضات

کریں گے اور طرح طرح کی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لیکن جن لوگوں کو قرآن کا پختہ علم حاصل ہے، وہ سمجھ لیں گے کہ اس قسم کے تمثیلی بیانات سے خدا کا مقصود کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا انہیں اس سے یقین حاصل ہوگا (۳۴) حتیٰ کہ جو لوگ (عام) ایمان والے ہیں، اس سے ان کا بھی ایمان بڑھ جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمثیلی بیانات سے، قرآن کا پختہ علم رکھنے والوں، یا عام مومنین کے دل میں کبھی شک اور اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جو لوگ نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں، یا قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا کھلے بندوں انکار کرتے ہیں، وہ جھٹ سے اعتراض کر دیتے ہیں کہ اس قسم کی مثالوں سے بالآخر خدا کا مقصود کیا ہے؟ (۳۵)

اس طرح، جو شخص اپنے اندر کج رنگی پیدا کر لیتا ہے، وہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق، اپنے اعمال کی بدولت، غلط راستے پر چل نکلتا ہے۔ اس کے سامنے صحیح راستہ آ نہیں سکتا۔ اور جو چاہتا ہے کہ وہ صحیح راستے پر چلے، اس کی راہ نمائی صحیح راستے کی طرف ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ، کائنات میں کس کس قسم کی قوتیں کارفرما ہیں، اور خدا کے لشکر کس کس انداز سے اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں، اس کا پورا پورا علم خدا ہی کو ہے۔ ان امور کا تمثیلی بیان اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ انسان، بات سمجھنے کی کوشش کرے اور قوانینِ خداوندی کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔

(۳۲-۳۵)۔ (یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ خدا کا قانونِ مکافات کوئی شے نہیں۔ اور جس انقلاب سے انہیں متنبہ کیا جاتا ہے وہ محض دھمکی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ وہ انقلاب ایک حقیقت ہے جو واقع ہو کر رہیگا۔ ان سے کہو کہ یہ ذرا کارگہ کائنات کے نظم و نسق پر اور جس قانونِ خداوندی کے ماتحت مظاہرِ فطرت، مصروفِ نقل و حرکت ہیں، اس پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ جس خدا کی لامحدود قوت یہ کچھ کر رہی ہے اس کے لئے اس قسم کا انقلاب لانا کون سا مشکل ہے؟ چاند کا اپنے وقت پر نمودار ہونا اور پھر مختلف منازل سے گزرنا، رات کی تاریکی کا صبح کی سپیدی میں تبدیل ہونا اور پھر روز روشن کا سامنے آ جانا — یہ تمام تغیرات، خدا کے قانونِ قدرت کی زندہ شہادات ہیں۔ اُس کے اسی قانونِ قدرت کے مطابق، یہ انقلاب آئیگا، جو تاریخ انسانی کے عظیم واقعات میں سے ہے۔ (یہ چاند کی طرح بتدریج بڑھے گا۔ اس کی ضوفشانیوں سے باطل کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور حق کی سحر درخشندہ نمودار ہو جائے گی۔)

(۳۶) ہم انہیں مطلع کئے دیتے ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ ہر شخص کو اس سے آگاہ رہنا چاہیئے۔

(۳۷)-(۳۸) یہاں پر فیصلہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ قوموں کی موت و حیات،

افراد کا آگے بڑھنا اور پیچھے رہ جانا، سب اُن کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سو جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے اور جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔ (اس سارے سلسلۂ رشد و ہدایت اور کشمکشِ حق و باطل سے مقصود یہ ہے کہ جو شخص چاہے اپنی کوشش سے زندگی کی ارتقائی منازل میں آگے بڑھ جائے، جو پیچھے رہنا چاہے پیچھے رہ جائے)۔ یاد رکھو! ہر شخص اپنے ہی اعمال کے شکنجے میں جکڑا ہوتا ہے اور انہی کی وجہ سے اس پر مصیبتیں آتی ہیں۔

(۳۹) البتہ، اصحابِ یمین و سعادت مصیبتوں میں گرفتار نہیں ہوں گے۔ وہ اپنے اعمالِ صالح کے بدلے جنت کی خوشگوار یوں میں رہیں گے۔

(۴۰-۴۲)۔ وہ ان مجرمین سے، جو تباہیوں کے عذاب میں مبتلا ہوں گے، پوچھیں گے کہ تمہیں اس جہنم میں کون سی چیز کھینچ کر لے آئی ہے۔ وہ تمہارے کون سے جرائم تھے جن کی یہ سزا ہے۔

(۴۳) وہ کہیں گے کہ ہمارا جرم یہ تھا کہ ہم ان لوگوں میں شامل نہ ہوتے جنہوں نے نظامِ صلوٰۃ قائم کیا۔

(۴۴) اور ہم ان لوگوں کے رزق کا سامان نہیں کرتے تھے جو کمائی کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے۔

(۴۵) (اس کے برعکس ہم ان لوگوں میں شامل تھے جو باتیں بڑی بڑی بناتے تھے (لیکن عملاً کچھ نہیں کرتے تھے)

(۴۶) اور یوں ہم خدا کے قانونِ مکافات کی تکذیب کرتے تھے، اور اس بات کو جھٹلاتے تھے کہ ایک دن ہمارے اعمال کے نتائج، تباہی بن کر ہمارے سامنے آئینگے۔

(۴۷) ہم اسی روش پر قائم رہے، تا آنکہ یہ تباہی حقیقت بن کر ہمارے سامنے آگئی۔

(۴۸) اُس وقت (نہ خود اُن کی کوئی پیش جائیگی۔ اور) نہ ہی ان کے حمایتیوں کی حمایت، ان کے کسی کام آئے گی۔

(۴۹) معلوم نہیں کہ جب یہ تمام حقائق اس طرح واضح طور پر ان کے سامنے پیش کر دیئے جاتے ہیں تو پھر انہیں کیا ہو جاتا ہے کہ یہ اس سے یوں روگردانی کرتے ہیں؟

(۵۰-۵۱) روگردانی ہی نہیں کرتے بلکہ اس طرح خوف زدہ ہو کر بھاگتے ہیں جس طرح بدکے ہوئے گدھے شیر کو دیکھ کر بھاگ اٹھتے ہیں۔ (کہ وہ کہیں انہیں کھا نہ جائے)

(۵۲)۔ (بات یہ نہیں کہ یہ حقائق ان کی سمجھ میں نہیں آتے۔ سمجھ میں تو آجاتے ہیں لیکن ان کی انفرادی مفاد پرستیاں انہیں اس طرف آنے سے روکتی ہیں۔ نظامِ خداوندی اجتماعی زندگی چاہتا ہے جس میں تمام افراد کے مفاد مشترک ہوں۔ لیکن) ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی مفاد پرستی کا کاروباری پروگرام

الگ الگ پھیلا ہوا ہو۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ معاشرہ کسی اجتماعی نظم و نسق کے ماتحت نہ چلے۔ بلکہ جس کا جی چاہے اپنی من مانی کرتا جائے۔ اور اجتماعی مفاداتِ انسانیت کے بجائے ہر شخص اپنے اپنے انفرادی مفاد کے پیچھے لگا رہے[1]

(۵۳) یہ اس لئے کہ ان کی نگاہ صرف مفادِ عاجلہ پر ہے۔ یہ نہ مستقبل کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کی تباہیوں سے خوف کھاتے ہیں۔

(۵۴) (لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا) یہ قرآن ایک کھلی ہوئی نصیحت اور تاریخی حقیقت ہے۔

(۵۵) سو جس کا جی چاہے اسے اپنے سامنے رکھ کر اس کے مطابق زندگی بسر کرے۔

(۵۶) لیکن اسے اپنے سامنے وہی لوگ رکھ سکتے ہیں جو اپنے مقاصد اور ارادوں کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لیں۔ یعنی جو اسی چیز کو اپنے سامنے رکھیں جو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو۔ یہی لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اور یہی ہیں جو تباہیوں اور بربادیوں سے محفوظ رہتے ہیں (۷۴/۵۶)

(۰)

سورۃ القیمۃ ۔ (۷۵)

(۱) ان سے کہو کہ نہیں۔ بات یوں نہیں جیسا کہ تم خیال کئے بیٹھے ہو کہ ہم جس طرح جی میں آئے کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ میں دورِ قیامت کو شہادت میں پیش کرتا ہوں (جب اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا)

(۲) اور اس شخص کو اس پر شاہد ٹھہراتا ہوں جو اپنی غلطی کے احساس سے نادم ہو[2] (۷۵/۲) ـــــ کہ خدا کا

---

[1] نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہی (LAISSEZ - FAIRE) اور (INDIVIDUAL ENTERPRISE) پر ہوتی ہے۔ یعنی کوئی کسی کے معاملے میں دخل انداز نہ ہو۔ ہر ایک اپنے اپنے مفاد کے پیچھے پڑا رہے۔

[2] یہ جو کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک قوت ہے جو حق اور باطل کی تمیز کر دیتی ہے (اسے ضمیر کی آواز کہتے ہیں) یہ غلط ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو حق اور باطل میں از خود تمیز کر دے۔ حق اور باطل کی تمیز وحیِ خداوندی کی رو سے ہوتی ہے۔ جب کسی شخص سے کسی ایسے فعل کا ارتکاب ہو جائے جو اس بات کے خلاف ہو جسے وہ حق سمجھتا ہے تو اس سے اسے احساسِ ندامت ہوتا ہے۔ اسے آپ ضمیر کی آواز کہہ سکتے ہیں۔

قانونِ مکافات ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ برآمد کرتا ہے۔ خواہ وہ اس دنیا میں اس کے سامنے آجائے، خواہ مرنے کے بعد۔

(۳) کیا انسان اپنے دل میں یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ جب وہ مر مرا کر ختم ہو جائے گا تو دوبارہ زندہ نہیں ہوگا؟ (۲/۲۵۹ ؛ ۳۶/۷۸ ؛ ۳۷/۱۶)۔ (اور اس طرح وہ اپنے غلط اعمال کی پاداش سے بچ جائے گا) کیا وہ سمجھتا ہے کہ جس چیز پر زندگی کی بنیاد استوار ہوتی ہے، وہ موت سے منتشر ہو جاتی ہے اور پھر مجتمع نہیں ہو سکتی۔ یہ اس کا خیال خام ہے۔

(۴) ہمارے لئے ایسا کرنا کیا دشوار ہے؟ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کے ان تمام قویٰ کو درست اور مکمل کر دیں جن سے اس کی زندگی قیام پذیر ہوتی ہے۔ اور اسے دوسری چیزوں کے تصرف پر گرفت حاصل ہو جاتی ہے۔

(۵) اصل یہ ہے کہ انسان حیاتِ آخروی سے اس لئے انکار نہیں کرتا کہ وہ اسے ناممکن سمجھتا ہے۔ حیاتِ آخروی پر یقین کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنا ایک ایک قدم احتیاط سے اٹھائے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے کوئی غلط کام نہ کرے لیکن انسان ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے سے جی چراتا ہے۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ جس طرح اس کی سابقہ زندگی (یعنی جتنی زندگی وہ گزار چکا ہے) غیر ذمہ دارانہ گزری ہے، اسی طرح باقی زندگی بھی بے راہ روی میں گزر جائے۔

(۶) اسی لئے جب اس سے قیامت کے متعلق کہا جاتا ہے تو اس کے دل میں جھٹ اعتراضات ابھرنے لگتے ہیں، اور وہ پوچھتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ قیامت کب آئے گی؟

(یہ کس قدر خود فریبی ہے؟ کیا انسان اپنے اعمال کے نتائج سے اس لئے بچ جائے گا کہ وہ خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں رکھتا؟ وہ ایمان رکھے یا نہ رکھے، وہ قانون اپنا کام کرتا جائے گا۔ مرنے کے بعد زندگی ہوگی اور اس کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آکر رہیں گے، خواہ یہ اس حقیقت سے کتنا ہی انکار کیوں نہ کرے)۔

(۷)۔ (باقی رہا یہ کہ قیامت کب آئے گی، تو اس کا علم تو صرف خدا ہی کو ہے۔ لیکن) جب وہ آئے گی تو حالت یہ ہوگی کہ مارے حیرت کے آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔

(یاد رہے کہ ایک قیامت اس دنیا میں بھی سامنے آجاتی ہے جب اعمال کے نتائج کا ظہور یہاں ہوتا ہے۔ اور ایک قیامت مرنے کے بعد واقع ہوتی ہے جس میں وہاں ظہورِ نتائج ہوتا ہے۔ یہاں کی قیامت باہمی قوموں کے باہمی تصادم کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس وقت نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں گی۔ اور)

(۸) چاند تاریک ہو جائے گا۔ (جاہلیت عرب کا اقتدار ختم ہو جائے گا)[1]

(۹) چاند اور سورج اکٹھے ہو جائینگے۔ (عرب اور ایران کی قوتیں مل کر ایک ہو جائینگی)[1]

(۱۰)۔ (ظہورِ نتائج کے وقت خواہ وہ اس دنیا میں ہو یا آخرت میں) انسان انتہائی پریشانی کے عالم میں کہے گا کہ اب میں کدھر بھاگوں اور کہاں پناہ لوں؟

(۱۱) اُس وقت کوئی ایسی جگہ نہیں ہوگی جہاں بھاگ کر پناہ لی جا سکے۔

(۱۲) اُس وقت انسان کا ٹھکانہ صرف عدالتِ خداوندی ہوگا۔ اُسکے کٹہرے سے بھاگ کر انسان کہیں نہیں جا سکیگا۔

(۱۳) اُس دن انسان کے اگلے پچھلے تمام اعمال کے نتائج اس کے سامنے آجائینگے۔

(۱۴) اس کے لئے نہ کسی خارجی گواہ کی حاجت ہوگی، نہ بیرونی ثبوت کی ضرورت۔ انسان اپنے خلاف خود آپ دلیل ہوگا۔ (اس کی ذات جس پر اس کے ہر عمل کا اثر منقوش ہوتا چلا جاتا ہے، اسکا اعمالنامہ بن جائے گی)۔

(۱۵) اِس وقت تو اس کی عقل بہانہ ساز اسکے اعمال کے جواز میں ہزار دلائل پیش کر دیتی، اور اسطرح حقیقت پر پردے ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ لیکن اُس وقت اُس کے تمام اعمال بے نقاب ہو کر سامنے آجائینگے اور کسی قسم کا کوئی بہانہ کام نہ دیگا۔

(۱۶) اس قسم کی بہانہ سازی کرنے والے سے کہہ دیا جائیگا کہ قینچی کی طرح زبان چلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تو چاہتا ہے کہ اس تیز کلامی سے معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ معاملہ اس طرح ختم نہیں ہو جائے گا[2]

---

[1] جاہلیت عرب کے جھنڈے کا نشان تارہ تھا اور ایرانی سلطنت کے جھنڈے کا نشان شمس۔ ان آیات میں اگر اس دنیا کی قیامتِ صغریٰ کی طرف اشارہ ہے تو اس سے مراد وہ انقلاب ہے جو ظہورِ اسلام سے عرب جاہلیت اور ایران کی سیاسی زندگی پر آنیوالا تھا۔

[2] آیات ۱۶ تا ۱۹ کو اگر سابقہ آیات کے ساتھ مسلسل لیا جائے تو مفہوم وہی ہوگا جو اوپر درج کیا گیا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ آیت ۱۶ سے ایک نیا مضمون شروع ہوتا ہے تو ان آیات کا مفہوم حسب ذیل ہوگا۔

"اے رسول! تم کسی معاملہ کے متعلق عملی قدم اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لو۔ اس وقت تک انتظار کرو جب تک اُس معاملہ کے متعلق پورا پورا پروگرام بذریعہ وحی نہ دے دیا جائے (۲۰/۱۱۴) اگرچہ یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہو رہا ہے لیکن تمہیں اس کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا جمع کرنا اور بحفاظت رکھنا ہمارے ذمے ہے۔ تمہارے ذمے اسکے احکام و قوانین کا اتباع کرنا ہے۔ اتباع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسکے مطالب نہایت وضاحت سے سامنے آجائیں۔ اسکا ذمہ بھی ہم نے خود ہی لے رکھا ہے۔ ہم ایک مضمون کو مختلف آیات میں بار بار لاتے ہیں اور اس طرح پوری پوری وضاحت کر دیتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کے سمجھنے کا طریقہ۔"

(۱۷) یہ کام خود ہم نے اپنے ذمے لے رکھا ہے کہ انسان کے اگلے پچھلے تمام اعمال کو اکٹھا کیا جائے اور پھر انہیں نہایت حفاظت سے رکھا جائے۔

(۱۸) سو جب ہم نے (تیرے اعمال کو) اسطرح جمع و ثبت کر رکھا ہے تو تجھے اس طرح جمع شدہ کے پیچھے پیچھے چلنا ہوگا۔ یعنی جس طرف تمہارے اعمال کے نتائج لے جائیں تمہیں اُسی طرف جانا ہوگا۔

(۱۹) اس طرح ہم تمہارے اعمال کے نتائج کو ظاہر کر کے تمہارے سامنے لے آئینگے۔

(۲۰) تم جو حیاتِ اُخروی سے اسطرح بدکتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم صرف مفادِ عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہو تم اسی دنیا کے فائدے حاصل کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیئے ہوئے ہو۔

(۲۱) اور مستقبل کی زندگی کا تمہیں کوئی خیال نہیں۔

(۲۲) حالانکہ مستقبل کی خوشگواریاں، مفادِ عاجلہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ شگفتہ و شاداب ہیں جن لوگوں کو یہ حاصل ہوں گی ان کے چہرے ہشاش بشاش اور تر و تازہ ہوں گے۔

(۲۳) اور وہ اپنے نشوونما دینے والے کی فیض گستری اور کرم فرمائی کا نظارہ دیکھ رہے ہوں گے۔

(۲۴) ان کے برعکس جن لوگوں کو یہ کچھ میسر نہ ہوگا ان کے چہرے افسردہ اور پژمردہ ہوں گے۔

(۲۵) اسلئے کہ انہیں یہ دھڑکا لگا ہوگا کہ اب وہ مصیبت آنیوالی ہے جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دیگی۔

(۲۶) (لہٰذا انہیں مستقبل کی زندگی کے متعلق ہرگز شک و شبہ نہیں کرنا چاہیئے) حقیقت یہ ہے کہ جس وقت انسان، سکراتِ موت کی ہچکیاں لیتا ہے اور سانس گلے میں اٹک جاتی ہے۔

(۲۷) اور ہر کہنے والا یہی کہتا ہے کہ اس وقت جو کچھ بھی بن پڑتا ہے کر لینا چاہیئے۔ (اگر دوا دارو سے فائدہ نہیں ہوتا تو) کسی جھاڑ پھونک والے کو بلا لو، شاید وہی اس کی جان بچا لے۔

(۲۸) اس سے مرنے والا سمجھ لیتا ہے کہ اب اس کا آخری وقت آپہنچا ہے۔

(۲۹) اُس وقت، اس کی، اور اس کے پسماندگان کی سختیاں اور مصیبتیں تو بر تو جمع ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ (ایک پر دوسری مصیبت چلی آتی ہے)

(۳۰) اُس وقت، انسان، ہر طرف سے کٹ کر، عدالتِ خداوندی کی طرف ہانک کر لایا جاتا ہے۔

(۳۱) (ان حقائق کی روشنی میں، تم اس شخص سے کہو) جو ہمارے قانونِ مکافات کی تصدیق نہیں کرتا، اور سیدھے راستے پر نہیں چلتا۔

(۳۲) بلکہ اُس کی تکذیب کرتا ہے اور اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔

(۳۳) اور اپنی اس روش پر اتراتا ہوا اپنے رفقاء کی طرف جاتا ہے۔

(۳۴) کہ اے بدنصیب! تیرے لئے کس قدر بہتر تھا کہ تو قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا۔

(۳۵) اے کاش! یہ بات تیری سمجھ میں آجاتی کہ وہ روش تیرے حق میں کس قدر بہتر تھی۔

(۳۶) انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہ انسان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے، نہ اس کے سفر کی کوئی متعین منزل، نہ مقررہ راستہ ہے نہ اس راستے پر چلنے کے قواعد و ضوابط۔ اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح جی میں آئے کرے اور جس طرف جی چاہے منہ اٹھا کر چل دے۔ اس تصورِ حیات کا نتیجہ ہے کہ وہ طبیعی زندگی کی مفاد پرستیوں کا تانا تنتا رہتا ہے اور اس میں انسانی ذات کی نشوونما کا بانا نہیں ڈالتا۔ اسطرح اس کی ساری زندگی بلا مقصد دوڑ دھوپ میں ضائع ہو جاتی ہے۔ (حالانکہ زندگی، مفادِ عاجلہ کے تانے اور مستقبل کے بانے سے کپڑا بننے کا نام ہے۔ یا یوں کہئے کہ زندگی عبارت ہے دنیا کے تانے میں دین کا بانا ڈالنے سے۔ اگر دین اور دنیا، روح اور مادہ، مستقل اقدار اور سیاست کا اسطرح امتزاج نہ ہو تو انسانی زندگی کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآنی تعلیم اسی کا امتزاج سکھاتی ہے اور یوں انسانی کوششوں کو نتیجہ خیز بنا دیتی ہے۔)

(۳۷) اسے سوچنا چاہیئے کہ حیاتِ انسانی کتنے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد انسانی پیکر تک پہنچی ہے۔ وہ ایک قطرۂ آب تھا جو رحم میں گرایا گیا۔

(۳۸) پھر اس نے رحمِ مادر میں ایک معلق شے کی سی شکل اختیار کی۔ پھر اس میں قسم قسم کے ترکیبی امتزاجات ہوئے۔ اور ازاں بعد، اس میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا ہوا۔

(۳۹) اور اس میں جنسی تفریق سے مرد اور عورت کے جوڑے بنے۔

(۴۰) کیا وہ خدا جو یہ کچھ کرتا ہے اس پر قادر نہیں کہ وہ مُردوں کو زندہ کر سکے؟ (جب مرنے کے بعد کی زندگی کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر قانونِ مکافات اور وحی کے پروگرام پر ایمان لانا مشکل نہیں ہوتا۔ یہ اس تمام پروگرام کی بنیاد ہے)۔

———(۰)———

سُورۃ الدّہر۔ (۷۶)

(۱) یہ حقیقت ہے کہ انسان (جو اس وقت پیکرِ بشریت میں موجود ہے) ان پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب یہ کوئی ایسی شے نہ تھا جو از خود موجود ہوتی۔ (پھر ہم اسے مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے آہستہ آہستہ اس مقام تک لے آئے)۔

(۲) ان مراحل میں ایک مرحلہ وہ تھا جب اسے نطفے سے پیدا کیا جو دیکھنے میں تو ذرا سا قطرۂ آب تھا، لیکن درحقیقت) گوناگوں مخلوط ممکنات کا مجموعہ تھا۔ ہم نے ایسا انتظام کیا کہ ان مضمر صلاحیتوں کی رفتہ رفتہ نمود ہوتی جائے۔ اس کے لئے، رحمِ مادر میں، اس کے مختلف پہلو بدلے گئے، تا آنکہ یہ صاحب بصیرت وسماعت انسان بن گیا۔

(۳) اس کے اسی صاحب بصیرت وسماعت (سوچنے سمجھنے کے قابل) ہونے کا نتیجہ ہے کہ اسے دیگر کائنات کی طرح ایک خاص راستے پر چلنے کے لئے مجبور نہیں پیدا کیا گیا، بلکہ اسے زندگی کے مختلف راستوں میں سے کسی ایک کے منتخب کر لینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس کی سماعت وبصارت اسکا فیصلہ تو کر سکتی ہے کہ وہ کونسا راستہ اختیار کرے لیکن صحیح راستے کا تعین ان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف وحیٔ خداوندی کر سکتی ہے۔ چنانچہ خدا نے اسے وحی کے ذریعے صحیح راستہ بتا دیا، اور پھر اسے آزاد چھوڑ دیا کہ یہ چاہے تو اس صحیح راستے کو اختیار کر لے، اور چاہے اس سے انکار کر کے، اپنے لئے دوسرا راستہ منتخب کر لے۔ اس سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اور مستوجب جزا و سزا۔

(۴) غلط راستے میں اس کے لئے، قدم قدم پر، طوق وسلاسل اور تباہیاں اور بربادیاں ہیں۔ (اندھی تقلید کی زنجیریں اور غیر اللہ کی محکومیت کے طوق، جنہیں دور کرنے کے لئے یہ رسول آیا ہے۔ ۷/۱۵۷)

(۵) اسکے برعکس صحیح راستے پر چلنے کا نتیجہ وسعت اور کشادہ ہوگا، یہ خصوصیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ انسان اپنے جلد مشتعل ہو جانے والے جذبات کو وحی کے تابع رکھ کر، ان میں برودت (ٹھنڈک) اور سکون پیدا کرے۔ (مومن کی زندگی حدّت اور برودت کے معتدلانہ امتزاج کا نام ہے۔ گویا کسی نے شراب[1] کی آتشِ سیال میں کافور ملا دیا ہو)

(۶) یہ "شراب" اس چشمے سے ملتی ہے جسے خدا کے بندے، خود اپنے دل کی گہرائیوں سے بہا کر لاتے ہیں، اور یہ ان کے اختیار میں ہوتا ہے کہ اس چشمے کی نالیوں کا رخ جدھر جی چاہے کر دیں (یعنی ان صلاحیتوں کو اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کریں)

(۷) یہ لوگ، نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کی ذمہ داری، برضا و رغبت اپنے سر پر لیتے ہیں، اور پھر اسے نہایت خندہ پیشانی سے پورا کرتے ہیں۔ انہیں ہر وقت اس کا احساس رہتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو معاشرہ ایسی شکل اختیار کر لے گا جس میں چار و نطرف شر پھیل جائے گا۔ ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو جائے گا۔ ساری فضا اس سے متاثر ہو جائیگی۔ یہ اڑ کر چمٹ جائیگا)۔

(۸) وہ اس عالمگیر فساد کو روکنے کے لئے، خدا کے نظامِ ربوبیت کو عام کر دیتے ہیں، یعنی ایسا انتظام کرتے ہیں کہ جو لوگ کام کاج کے قابل نہ رہیں، یا جو معاشرہ میں تنہا (بے یار و مددگار) رہ جائیں، یا جو کسی اور مصیبت

[1] عربی زبان میں شراب، ہر پینے والی چیز کو کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں یہ لفظ، "شراب" (خمر) کے لئے ہی استعمال ہوتا ہے۔

میں مبتلا ہو جائیں ۔ انہیں سامانِ رزق بہم پہنچایا ہے ۔ حالانکہ انفرادی مفاد پرستی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی لئے رکھ لے ۔ وہ ان جذبات کے علی الرغم ، دوسروں کی پرورش کی فکر کرتے ہیں ۔

(۹) وہ جن کے لئے یہ کچھ کرتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ تم یہ نہ سمجھو کہ ایسا کرنے سے ہم تمہارے سر پر "احسان" دھرتے ہیں ۔ قطعاً نہیں ۔ ہم اس کے بدلے میں تم سے کچھ نہیں چاہتے ۔ حتیٰ کہ ہم شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ۔ ہم اسے اپنا فریضہ سمجھتے ہیں بلکہ یوں سمجھو کہ اس میں خود ہمارا اپنا فائدہ ہے ۔ اس سے ہماری ذات کی نشو و نما ہوتی ہے ۔ اس میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے ۔ اور یہی انسانی زندگی کا مقصود ہے ۔

(۱۰) اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، ہم یہ انتظام اسلئے کرتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایسی فضا پیدا ہو جائیگی جس میں زندگی کی شادابیاں جھلس کر رہ جائینگی ۔ اور شجرِ حیات افسردہ و پژمردہ ہو جائیگا ۔ اور ہر طرف ایسی مصیبتیں اور پریشانیاں پھیل جائینگی جن سے لوگوں کے ماتھے پر شکنیں پڑ جائیں ۔ اطمینان و مسرت کا نام و نشان تک باقی نہ رہے ۔

(۱۱) اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کا قانونِ ربوبیت انہیں اس قسم کے دور کی ہلاکت سامانیوں سے بچا لیتا ہے ، اور مسرتیں اور بشاشتیں انہیں گلے لگا لیتی ہیں ۔

(۱۲) یہ جنتی فضائیں ، ان کے استقلال و استقامت کا نتیجہ ہوتی ہیں ۔ اس میں وہ بڑی آسائش و توانائی کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ شادابیوں کے باغات اور حرارت بخش و حریت افزا فضائیں ۔

(۱۳) اس میں وہ اقتدار و اختیار کی مسندوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہونگے ۔ وہاں نہ سخت گرمی ہوگی نہ سخت سردی ۔ (ہمیشہ بہار کا موسم رہیگا) ۔

(۱۴) چاروں طرف سے گھنے درختوں کے سائے ان پر جھکے ہونگے اور ان کی شاخیں پھلوں سے لدی ہونگی ۔ سامانِ زیست و راحت کی کوئی شے انکی دسترس سے باہر نہیں ہوگی ۔ اسے حاصل کرنے کے لئے انہیں جانکاہ مشقتیں نہیں اٹھانی پڑینگی بلکہ وہ خود ان کے قریب جھک کے آجائیگی ۔

(۱۵) چاندی کے برتنوں میں کھانے ، شیشے کے آبخوروں میں مشروبات ۔ یہ سب کچھ ان کے گرد گردش کرینگے ۔

(۱۶) خود چاندی کی چمک شیشے جیسی ہوگی اور یہ سب برتن اور آبخورے ٹھیک ٹھیک انداز سے اور پیمانے کے مطابق بنائے گئے ہوں گے ۔

(۱۷) وہاں انہیں ایسا کچھ پینے کو ملیگا ، جو زندگی بخش توانائیوں اور حرارتوں سے بھرپور ہوگا ۔ اس سے وہ اس قابل ہو سکینگے کہ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اوپر چڑھتے اور آگے بڑھتے جائیں (۷۶/۱۷) ۔ (یعنی ایک طرف یہ کیفیت کہ جذبات میں ذرا سا اشتعال پیدا ہونے لگے تو وحیِ خداوندی کی پابندی ، ان میں ٹھنڈک پیدا کرکے ، مزاج کو اعتدال پر لے آئے (۷۶/۵) اور دوسری طرف یہ حالت کہ حرکت و عمل میں ذرا بھی سستی آنے لگے تو بھرپور حرارت و توانائی مل جائے)

(۱۸) یہ زندگی بخش "شراب" ایک ایسے چشمے سے ملیگی جو اپنا راستہ دریافت کرتا ہوا پیچھے سے چلا آتا ہے اور اسی طرح آگے بہے چلا جائیگا (۷۶/۱۸) (یعنی اس سے انسان ، علمی تحقیقات کے بعد زندگی کی نئی نئی راہیں تراشنے کے قابل ہو جائیگا ۔ اور اس طرح علم و تحقیق کی جوئے رواں کے ساتھ زندگی آگے بڑھتی چلی جائے گی ۔

(۱۹) ان کے نیچے بھی زیورات سے مزین ان کے ارد گرد گھوم رہے ہونگے (ےۓ) ایسے ہشاش بشاش، تر و تازہ، تندرست و توانا گویا موتیوں کے دانے ہیں جو بکھرے پڑے ہیں۔ یعنی ان کی صحیح تعلیم و تربیت سے ان کی سیرت گہر آبدار کی طرح پاکیزہ ہوگی۔ لیکن انہیں صدف میں بند نہیں رکھا جائے گا بلکہ معاشرہ میں منتشر کر دیا جائیگا اور اسکے باوجود وہ اپنی پاکیزگی کو ملوث نہیں ہونے دینگے۔

(۲۰) تو اس معاشرہ پر جب اور جدھر سے بھی نگاہ ڈالیگا، اسمیں آسودگی اور آسائش بھی دکھائی دیگی اور قوت و اقتدار بھی۔ یہ معاشرہ جلال و جمال کا حسین ترین مجموعہ ہوگا۔ (جلال و جمال دونوں کا امتزاج، انسانی ذات کو بلندیوں کیطرف لے جاتا ہے)۔

(۲۱) آسائشوں کیطرف جائیے تو وہ باریک اور دبیز ریشمی پارچات میں ملبوس ہونگے۔ اور اقتدار کیطرف دیکھئے تو انکے ہاتھوں میں سر داریوں کے کنگن ہونگے۔ لیکن ان میں، نہ تو ان آسائشوں سے عیش پرستی کی خباثتیں پیدا ہونگی اور نہ ہی جاہ و اقتدار سے نشۂ قوت کی بدمستیاں۔ انہیں انکا نشوونما دینے والا، وہ کچھ پینے کو دیگا جس سے ان کے قلب و نگاہ میں پاکیزگی پیدا ہو (یعنی وحی کی راہ نمائی)

(۲۲) ان سے کہا جائیگا کہ یہ سب کچھ تمہاری اپنی جدوجہد کا نتیجہ ہے جو اب ثمر بار ہو کر، تمہارے سامنے آگیا ہے۔ تم نے دیکھا کہ تمہاری محنت کس طرح ٹھکانے لگی ہے؟

(۲۳) (یہ ہے، اے رسولؐ! جنتی معاشرہ جس کی تشکیل کیلئے) ہم نے تجھ پر یہ ضابطۂ حیات بتدریج نازل کیا ہے تاکہ اس پر ساتھ کے ساتھ عمل ہوتا رہے۔

(۲۴) لہٰذا، تو اس خدائی پروگرام پر نہایت استقامت سے گامزن رہ اور ان میں سے کسی ایسے کی بات نہ مان جو اس کے خلاف راستے پر گامزن ہو۔ ذاتی مفاد پرستی کے غلط راستے پر چلنے سے انسان کی قوتِ عمل معطل ہو جاتی ہے یا اسکی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جاتی ہیں۔ جو شخص ایسے لوگوں کی بات پر کان دھریگا، اس کی بھی یہی حالت ہو جائیگی (کہ یا تو اس کی انسانی صلاحیتوں کی نمود ہی نہیں ہو سکے گی اور اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ انہیں تخریبی کاموں میں ضائع کر کے، افسردہ خاطر کاروانِ انسانیت سے بہت پیچھے رہ جائیگا)۔

(۲۵) اس سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ تو صبح و شام، ہر وقت، خدا کی صفتِ ربوبیت کو اپنے سامنے رکھ اور اسکی روشنی میں نظامِ ربوبیت کی تشکیل میں سرگرمِ عمل رہ۔

(۲۶) دن تو دن، رات کیوقت بھی اُسی کے قوانین کی اطاعت کر اور اپنے پروگرام کی تکمیل کی فکر میں اپنی پوری وسعتوں کیساتھ منہمک رہ۔

(۲۷) جو لوگ تیری مخالفت کر رہے ہیں، وہ اپنے اپنے پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ انکی زندگی کا مقصود منتہیٰ یہی طبیعی زندگی کے مفاد ہیں۔ اسلئے وہ اپنے عظیم الشان انقلاب کو نظر انداز کر رہے ہیں (جو حال اور مستقبل دونوں کی خوشگواریوں کا ضامن ہے)

(۲۸) (انہیں اس پر بڑا ناز ہے کہ وہ بڑے صاحبِ قوت اور مضبوط لوگ ہیں لیکن یہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ) ہم ہی نے انہیں پیدا کیا ہے اور ان کے پیکروں کا یہ استحکام اور مضبوطی بھی ہماری ہی عطا کردہ ہے لہٰذا، اگر یہ ہمارے قوانین کی مخالفت کرینگے۔ تو ہمارے لئے کچھ بھی مشکل نہیں کہ ہم اپنے مشیت کے پروگرام کیمطابق، ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں۔

(۲۹) یہ ایک حقیقت ہے جسے ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ جس جس کا جی چاہے، اس سے عبرت حاصل کر کے، وہ راستہ

اختیار کرلے جو اسے خدا کے نظامِ ربوبیت کیطرف لے جائے۔

(۳۰) ان سے کہدو کہ یہ اس صورت میں ہوسکیگا کہ تم اپنے اختیار و ارادہ کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کرلو (تم ویسا ہی چاہو جیسا قانونِ خداوندی کا منشا ہے) اس لئے کہ خدا کا قانون علم و حکمت پر مبنی ہے۔ (۷۶ : ۲۹-۳۰)

(۳۱) تم ایسا چاہو گے تو خدا تمہیں اپنی رحمتوں کے سایہ تلے لے آئیگا۔ لیکن اگر تم نے وہ کچھ نہ چاہا جو قانونِ خداوندی کا منشاء ہے تو یہ ظلم و سرکشی ہوگی۔ اور (یاد رکھو!) جو لوگ ظلم و سرکشی کا شیوہ اختیار کرلیتے ہیں ان کے لئے ہمارے قانونِ مکافات نے تباہیوں اور بربادیوں کا الم انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔

سورۃ المرسلات (۷۷)

اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

(۱) وہ کائناتی قوتیں، جنہیں پیہم اور متواتر بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ

(۲) ان نظریات، تصورات اور نظامہائے زندگی کو جن میں بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت نہ ہو، خس و خاشاک کیطرح اڑا کر ہنگامہ حیات سے دور پھینک دیں اور یوں دانے کو بھوسے (حق کو باطل) سے الگ کردیں۔

(۳) اور جس زمین (نظامِ زندگی) میں نشو و نما کی صلاحیت ہے اس میں سرسبزی و شادابی کا سامان پیدا کرکے اسے دور دور تک پھیلا دیں (کہ دنیا میں وہی نظام باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ ۱۳/۱۷)

(۴) اور اسطرح تخریبی اور تعمیری نتائج پیدا کرنے والے عناصر کو ایک دوسرے سے الگ کرتی جائیں۔

(۵) اور ان ٹھوس حقائق کو تاریخی شواہد کی حیثیت سے پیش کرتی جائیں۔ تاکہ نظامِ کائنات میں

(۶) منفی اور مثبت قوتوں کی اس کارفرمائی کو دیکھ کر، اور یوں اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد جو مٹنا چاہے مٹ جائے، اور جو خطرات سے آگاہ ہوکر ان سے بچنا چاہے بچ جائے۔

(۷) تدابیر الٰہیہ کا یہ تمام نظم و نسق اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جس انقلاب کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ واقع ہوکر رہیگا (اور عام حالات میں جو کچھ کائناتی قوتیں تنہا کرتی ہیں اور اسطرح صدیوں میں جا کر کہیں ایک ارتقائی مرحلہ طے ہوتا ہے، جماعتِ مومنین کی رفاقت سے وہ مراحل دنوں میں طے ہو جاتے ہیں)۔ (۸) اُس وقت مخالفین کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی قوت ماند پڑ جائیگی۔

(۹) اور بڑی بڑی بلندیوں کے حامل سرداروں کی رفعت و شوکت کے پرخچے اڑ جائینگے۔

(۱۰) اور پہاڑوں جیسی محکم جماعتیں پرِکاہ کی طرح اڑ جائینگی۔ یوں سمجھو جیسے انہیں چھلنی میں چھان اور چھاج میں پھٹک دیا جائیگا۔ اور جو باقی رہنے کے قابل ہوگی وہ باقی رہ جائیگی۔ دوسری سب ضائع ہو جائیں گی۔ (۲۰/۱۰۵ : ۵۶/۵)

(۱۱) جب تمام پیغام پہنچانے والوں کا وقت (پروگرام) مقرر کر دیا جائیگا (کہ ان میں سے کس نے کب اور کیا کام کرنا ہے)
(۱۲) یہ انقلاب کس وقت تک کے لیے ملتوی کیا گیا ہے ؟
(۱۳) اسوقت تک جب ہر معاملہ کا فیصلہ ہو جائیگا۔ ہر شے نکھر کر الگ الگ ہو جائیگی۔ یہ یوم الفصل ہوگا۔
(۱۴) وحی خداوندی سے بڑھ کر تجھے کون بتا سکے گا کہ "یوم الفصل" کیا ہوگا۔
(۱۵) اس دن (یعنی اس دور میں) ان لوگوں کے لئے تباہی ہوگی جو خدا کے قانونِ مکافات کی تکذیب کرتے ہیں۔
(۱۶) (ان تکذیب کرنیوالوں سے پوچھو کہ) کیا ہم نے ان سے پہلے گزری ہوئی قوموں کو جنہوں نے اسطرح ہمارے قوانین کی تکذیب کی تھی، تباہ نہیں کیا۔
(۱۷) پھر ان کے بعد دوسری قومیں آئیں (اور جب انہوں نے بھی ویسا ہی طرزِ عمل اختیار کیا تو ان کا انجام بھی ویسا ہی ہوا)
(۱۸) (یہ بات نہ کسی خاص قوم سے متعلق ہے، نہ تاریخ کے کسی خاص دور تک محدود) ہم تمام مجرمین کیساتھ یہی کچھ کرتے ہیں۔ (ہمارا قانونِ مکافات ہر مجرم قوم کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرتا ہے)۔
(۱۹) لہٰذا، اس دور میں بھی ان لوگوں کے لئے تباہی ہوگی جو ہمارے قوانین کی تکذیب کریں گے۔
(۲۰) (ان سے کہو کہ) ذرا تم اپنی پیدائش کے سلسلہ میں غور کرو اور دیکھو کہ تم کن کن تخلیقی مراحل میں سے گزرے ہو؟ ہم نے تمہیں اس مادہ تولید سے پیدا کیا جو بڑا حقیر سا تھا۔
(۲۱) پھر اس مادۂ تولید کو رحم کے اندر ٹھہرایا اور وہ وہاں مادہ کے مبیضہ میں قرار گیر ہوگیا ($\frac{23}{12}$)
(۲۲) اور وہاں ایک مقررہ پیمانے کے مطابق نشوونما پاتا رہا۔
(۲۳) اسطرح ہم نے تمام امور کے اندازے اور پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اور ہمارے مقرر کردہ پیمانے نہایت عمدگی سے اپنے نتائج مرتب کرتے رہتے ہیں۔
(۲۴) انہی پیمانوں کیمطابق انسانی اعمال بھی اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ لہٰذا جب اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آئیگا، تو یہ لوگ جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں، دیکھ لینگے کہ ان کے لئے کس قدر تباہی ہے۔
(۲۵-۲۶) پھر ان سے کہو کہ اپنے آپ سے ہٹ کر، ذرا خارجی کائنات پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہم نے مثلاً زمین کو کسطرح ایسا بنا دیا ہے کہ وہ جاندار اور بےجان اشیاء کو سمیٹے ہوئے کس تیزی سے چلی جا رہی ہے؟ (یہ زمین کی کشش ثقل ہے جس سے ہر شے، اس کی برق رفتاری کے باوجود اس سے الگ نہیں ہوتی)۔
(۲۷) پھر اس میں ایکطرف بڑے بڑے اونچے پہاڑ ہیں جو اپنے اپنے مقام پر محکم کھڑے ہیں۔ دوسری طرف اسی میں سے پانی کے شیریں اور خوشگوار چشمے نکال دیئے ہیں جو مسلسل بہتے رہتے ہیں۔
(۲۸) دیکھو! یہ سب کچھ کس طرح ہمارے لگے بندھے قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ اسی طرح مکافاتِ عمل کا قانون

بھی ہے۔ جو لوگ اس قانون کی تکذیب کرتے ہیں ان کے لئے تباہی ہے۔

(۲۹) جب ظہورِ نتائج کا وقت آئیگا تو ان سے کہا جائیگا کہ تم اُس تباہی کی طرف چلو جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔

(۳۰) یعنی آتشیں دھوئیں کے اُس سائبان کی طرف چلو جس کی تین بڑی بڑی شاخیں ہیں۔ (ایک شاخ سر کے اوپر چھائی ہوئی اور دو انسان کو آگے اور پیچھے سے گھیرے ہوتے)۔ (۳۱) وہ سائبان تو ہے لیکن ایسا نہیں جو دھوپ یا شعلوں کی تپش سے بچا سکے۔

(۳۲) شعلوں کی تپش سے بچانا تو ایک طرف، وہ خود بڑے بڑے گٹھوں جیسے شعلے پھینکتا ہے۔

(۳۳) ایسا نظر آتا ہے کہ وہ شعلے نہیں بڑے بڑے زرد اونٹ ہیں۔ (۳۴) سوچو کہ اس دن ان تکذیب کرنیوالوں کیلئے کس قدر تباہی ہوگی۔

(۳۵) اُس دن کسی کے بات کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوگی (اسلئے کہ اسوقت نتائج خود بخود بے نقاب ہو کر سامنے آجائینگے)

(۳۶) اور نہ ہی انہیں اسکی اجازت ہوگی کہ وہ کوئی عذر پیش کر سکیں (اسلئے کہ یہ نتائج اس خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہونگے جو جانتا ہے کہ کسی جرم کے متعلق کسی کی ذمہ داری کس حد تک ہے۔ اُسی کے مطابق نتیجہ مرتب ہوتا ہے)۔

(۳۷) اُس دن ان تکذیب کرنیوالوں کے لئے بڑی تباہی ہوگی۔ (۳۸) ان سے کہا جائیگا کہ) یہ وہ فیصلہ کا دن ہے جس کے لئے ہم نے تم سب (اولین و آخرین) کو اکٹھا کیا ہے۔ (۳۹) تم ہمارے پروگرام کیخلاف بڑی بڑی تدبیریں کیا کرتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی تدبیر باقی ہے، تو اسے بھی آزما دیکھو! (لیکن تدبیر باقی کہاں ہوگی؟)۔ (۴۰) اس دن مکذبین کے لئے بڑی تباہی ہوگی۔ (۴۱) انکے برعکس، وہ لوگ جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے تھے، ایسے باغات کے سایے میں ہوں گے جن کے نیچے چشمے رواں ہوں گے۔ (۴۲) اور ان کے حسب پسند میوے۔

(۴۳) ان سے کہا جائے گا کہ یہ سب تمہارے اعمال کے ثمرات ہیں۔ انہیں نہایت خوشگواری سے کھاؤ۔

(۴۴) ہم ان لوگوں کو جو حسن کارانہ انداز سے متوازن زندگی بسر کریں ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

(۴۵) (ان کے لئے کسی قسم کی تباہی نہیں ہوگی)۔ تباہی ہوگی اُن کے لئے جو ہمارے قوانین کو جھٹلاتے تھے۔

(۴۶) ان سے کہو کہ تم طبیعی زندگی کے مفاد کے پیچھے پڑے تھے اور اسی کو منتہا و مقصود سمجھے ہوئے ہو سو تم کچھ وقت کیلئے کھا پی لو اور سامانِ زیست سے فائدہ اٹھا لو۔ (طبیعی زندگی کو منتہیٰ و مقصود سمجھنے والے حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں جس میں کھانے پینے کے سوا کوئی مقصدِ حیات ہی نہیں ہوتا۔ یہ) لیکن تم ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہو (اسلئے تمہارا انجام بڑا خراب ہوگا)

(۴۷) جو بھی ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں ان کا انجام خراب ہوتا ہے۔

(۴۸) ان سے جب کہا جاتا ہے کہ تم ہمارے قوانین کے سامنے جھک جاؤ، تو یہ اسکے سامنے کبھی نہیں جھکتے۔

(۴۹) بلکہ اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

(۵۰) ہم نے تمام امور نہایت وضاحت سے بیان کر دیئے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس پر بھی ایمان نہیں لاتے تو ان سے پوچھو کہ اس کے بعد وہ کونسی بات ہوگی جس سے یہ ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لائینگے؟

خدا اور سرمایہ

ایک بصیرت افروز اور معلومات افزا پیش کش

- کیا اسلام، مغرب کے معاشی نظام کا حامی ہے ـــــــــ؟
- کیا اسلام، اشتراکی نظام کا حامی ہے ـــــــــ؟
- کیا اسلام کا کوئی اپنا معاشی نظام ہے ـــــــــ؟
- اس نظام کی تفاصیل کیا ہیں ـــــــــ؟
- وہ کس طرح دوسرے معاشی نظاموں سے مختلف ہے ـــــــــ؟
- کیا وہ نظام، نوعِ انسان کے معاشی مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکتا ہے ـــــــــ؟
- اس نظام کی مخالفت کس طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے، اور کیوں؟

یہ، اور اسی قسم کے دیگر معاشی مسائل کا تجزیہ، تبصرہ اور حل۔ عصرِ حاضر کے پریشاں انسان کے لئے شارعِ امید۔ اہلِ پاکستان کیلئے قندیلِ راہ۔

قسم اعلیٰ ـــ سفید پرنٹنگ پیپر۔ نہایت روشن طباعت۔ مضبوط جلد۔ حسین گرد پوش۔

قیمت ـــ نو روپے

سستا ایڈیشن ـــ نیوز پرنٹ۔ بکس بورڈ کور ـــ قیمت ـــ پانچ روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ـ ۲۵ ـ بی ـ گلبرگ ـ لاہور

تین اہم کتابیں

قرآن کریم کو براہِ راست سمجھنے اور اسلام کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے لئے حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے ۔

(۱) لغات القرآن :

قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی ان کے مادوں کے اعتبار سے متعین کئے گئے ہیں ۔ پھر مختلف آیات سے بتایا گیا ہے کہ قرآن نے انہیں کس طرح استعمال کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلام کی تعلیم کے بنیادی تصورات کو نہایت واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ یہ بڑی مستند اور معلومات افزا کتاب ہے ۔ اس کے گہرے مطالعہ سے قرآن کریم خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے ۔ کتاب اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ اور ٹائپ میں چھپی ہے اور مجلد ہے ۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد اور چوتھی جلد کی قیمت بارہ روپے ہے ۔ پورا سیٹ پچاس روپے میں مل سکتا ہے ۔

(۲) سلیم کے نام خطوط :

تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جس قدر سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت صاف واضح اور مدلل جواب خطوط کی شکل میں ۔ اس کتاب نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں صحیح قرآنی انقلاب پیدا کر دیا ہے ۔ عمدہ سفید کاغذ ۔ ٹائپ کی حسین چھپائی ۔ مجلد ۔ قیمت جلد اول آٹھ روپے ۔ جلد دوم و سوم چھ چھ روپے ۔

(۳) انسان نے کیا سوچا :

گذشتہ اڑھائی ہزار برس میں دنیا کے ممتاز ترین ، مفکرین ، مؤرخین ، سیاستدانوں اور سائنس دانوں نے زندگی کے بنیادی مسائل کو خالص عقل کی رو سے حل کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان کا نہایت دلکش بیان اور اس حقیقت کی وضاحت کہ کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کو حل کر سکتی ہے یا اسے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے ۔ بڑی تقطیع ، سفید کاغذ ۔ اعلیٰ درجہ کی ٹائپ کی چھپائی ۔ قیمت مجلد بارہ روپے ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ، ۲۵/بی گلبرگ ۔ لاہور